قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

ماہنامہ ـــــ لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ)

۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

پوسٹ کوڈ ـــ ۵۴۶۶۰

ٹیلیفون : ۸۷۶۲۱۹

فہرست مضامین

لمعات	ادارہ	۲
روئیداد کنونشن ۹۳ء	ادارہ	۷
جشنِ نزولِ قرآن	کویت بزم	۱۷
تم سبھی کچھ ہو	اعزاز الدین احمد	۲۰
اکیسویں صدی کے تقاضے	حنیف وجدانی	۳۳
تعلیم و تربیت	کویت بزم	۳۶
اجتہاد کی اہمیت	عبداللہ خالد خاں	۴۸
ایک خط	ڈاکٹر حامد حسین	۵۳
بھارت سے بوسنیا تک	اے آر خان	۵۵
تکملہ	ڈاکٹر سید عبدالودود	۵۶
بیادِ سرسید	ادارہ	۵۸
بچوں کے لئے	غلام احمد پرویزؒ	۵۹
صبحِ قیامت	سامعہ اسحاق	۶۱
قائدِ اعظمؒ کا ارشاد		۶۴
طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک	ادارہ (آخری ٹائٹل)	

مجلسِ ادارت

مُدیرِ مسئول: محمد لطیف چوہدری

معاون : ثریا عندلیب

ڈاکٹر صلاح الدین اکبر

ناشر : عطاء الرحمٰن آرائیں

طابع : سید عبدالسلیم

مطبع : آفتاب عالم پریس

۱۳۔ ہسپتال روڈ۔ لاہور

فون۔ ۲۲۷۳۹۲

مقامِ اشاعت : ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲، لاہور ۱۱

جلد ۴۶ ـ مئی ۱۹۹۳ء ـ شمارہ ۵

بدل اشتراک

سالانہ

پاکستان ـــــ ۱۲۰ روپے

بیرونی ممالک ـــــ ۱۸ امریکی ڈالر

فی پرچہ : -/۱۰ روپے

لمعات

(گذشتہ سے پیوستہ)

سوچئے، غور کیجئے تحریکِ قیامِ پاکستان کے وقت ہم کیا تھے اور جیسے ہم تھے اس کی وجہ کیا تھی؟ ــــ کیا ایک حقیقت نہیں ہے کہ اس وقت ہم نہ شیعہ تھے، نہ سُنّی تھے، نہ کسی اور فرقے سے اپنا واسطہ رکھنے کی وجہ سے ہم اس کارواں سے کٹے ہوئے تھے جو ایک الگ وطن کے لئے جدّوجہد کا سفر کر رہا تھا، نہ ہم پنجابی تھے، نہ پختون، نہ سندھی، نہ بلوچی اور نہ ہی بنگالی ــــ عام معنوں میں نہیں، ہم یہ سب کچھ تھے مگر ان میں سے کسی نسبت نے ہمیں اس جدّوجہد میں شرکت سے نہیں روکا تھا، ــــ ہمارا درد ایک تھا، ہمارا نظریہ ایک تھا، ہماری منزل ایک تھی، کوئی فروعی نسبت ہمیں سوادِ اعظم میں شامل ہونے سے نہ روک سکی تھی ــــ علامہ اقبالؒ نے اس برِّصغیر کے مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ کرنے کا جو خواب دیکھا تھا اور جس خواب کو تعبیر بخشنے کے لئے انہوں نے قائدِاعظمؒ کا انتخاب کیا تھا ــــ قائدِاعظمؒ نے بکھرے ہوئے قافلے کو سوئے حرم لے جانے کا عزم کیا، انہیں احساس دلایا کہ وہ اقلیت نہیں مستقل بالذات ایک قوم ہیں جن کا کلچر، جن کی زبان ــــ بلکہ جن کا فلسفۂ حیات الگ ہے اور بحیثیت قوم انہیں اپنے تصورات کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہے۔ ایک قوم کو بہرحال ایک خطۂ زمین کی ضرورت تھی۔ نسل، رنگ، زبان، زمین پر کھینچی ہوئی لکیریں قوم نہیں بناتیں بلکہ تصورِ حیات اور ایمان ہی انسانوں کو ایک لڑی میں پروتا ہے، انہیں شانہ بہ شانہ کھڑا کرتا ہے ــــ یہی نہیں، یہ رشتہ اُن کے دلوں کو جوڑتا ہے، اکٹھے جدّوجہد پہ آمادہ کرتا ہے اور انہیں مقاصد کے حصول کے لئے استقامت بخشتا ہے ــــ قائدِاعظمؒ نے منتشر قطروں کو اکٹھا کر کے ایک بحرِ ذخّار بنایا اور پھر اسے ساتھ لے کے یوں آگے بڑھے کہ کوئی چیز ان کے راستے میں حائل نہ ہو سکی، نہ ہندو کا روپیہ اور چالاکی، نہ انگریز کی سیاست اور قوّت اور نہ ہی کچھ اپنوں کی خود فریبی، نہ سیکولر نظریات کے حامی بزعمِ خود روشن خیال اور نہ ہی منبر و محراب کے وہ مقدّس علمبردار جو اسلام کو بھی دوسرے مذاہب کی طرح چند رسوم، چند عبادات، کچھ معتقدات تک محدود سمجھتے تھے، اسے ایک طرزِ زندگی، ایک نظامِ حکومت کا منبع نہ جانتے تھے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد قائدِاعظمؒ کو مہلت نہ ملی کہ اقبالؒ کے تصورِ مملکت کو ایک

عملی شکل دے سکتے اور ان کے بعد ہمارے قافلے میں اقبال کی سوچ کو لے کر آگے چلنے والا کوئی نہ تھا۔

قائداعظمؒ نے کھلے دل سے سب کو قبول کیا تھا، کسی کے خلاف کوئی قدغن نہ لگائی تھی، وہ جو خود کو نیشنلسٹ مسلمان کہتے تھے، وہ جو مسلمانوں کو بس نسلی مسلمان سمجھتے تھے اور خود مسلمانوں کو بھان متی کا کنبہ کہتے تھے۔ انہیں بھی اس مملکت کے برابر کے شہری اور اس کی تعمیر و ترقی میں برابر کے شریک سمجھا تھا۔ اور اس میں شرکت کی اجازت دی تھی ان کے آنکھیں بند کرتے ہی پر پُرزے نکالنے شروع کر دیئے اور سب اس مملکت کا دامن اپنی اپنی سمت کھینچنے لگے۔

اس مرحلے پہ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ قائداعظمؒ اور علامہ اقبالؒ چاہتے کیا تھے، ان کے اذہان میں پاکستان کا کیا تصور تھا، اس کے لئے ہمیں ان کے افکار کا مطالعہ کرنا ہوگا کیونکہ اس کے بغیر ہم اپنی سمت کا صحیح تعین نہیں کر سکتے۔ یہ بات تو ان کے مخالف بھی سمجھتے اور کہتے تھے، اقبال کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی کتاب 'زندہ رود' میں مولانا نجم الدین اصلاحی (مرتب مکتوبات شیخ الاسلام) کے اس قول کا حوالہ دیتے ہیں۔

"پاکستان میں قانون سازی کا اصول فکرِ اقبال کی روشنی میں تو ہو سکتا ہے کیونکہ پاکستان جس اسلام کے نام پر بنا ہے وہ مرحوم کے فلسفہ کا دوسرا نام ہے۔"

ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں۔

"آخر اقبالؒ کا تصورِ اسلام کیا ہے، مختصراً یہی کہ ایک نیا مسلم معاشرہ وجود میں لایا جائے جو اجتہادی نقطۂ نگاہ سے قرآن و سنت کی روشنی میں وقت کے جدید تقاضوں کے مطابق اپنے تمام مسائل حل کرنے کی اہلیت رکھتا ہو، علماء پاک و ہند نے ہمیشہ اس قسم کی اجتہادی آزادی کو شبہ کی نگاہ سے دیکھا۔"

زیادہ تفصیل میں گئے بغیر اور لمبی چوڑی بحث سے دامن بچاتے ہوئے آیئے ہم دیکھیں اقبال نے اس بارے میں کیا کہا تھا اور قائداعظم اسے کس صورت میں جلوہ گر دیکھنا چاہتے تھے۔

اقبالؒ نے خطبہ الہ آباد میں اس خطۂ زمین کے حصول کے بعد جو ان کے تصور میں تھا کہا۔ "اسلام کو وہ موقع میسر آئے گا کہ عرب ملوکیت کی مہر اپنے آپ سے ہٹا سکے اور اسے یہ موقعہ ملے کہ وہ اپنے کلچر، اپنی تہذیب، اپنے تمدن کو ایک طرف اپنی اصلی روح سے ہم آہنگ کر سکے اور دوسری جانب زمانہ حال کی روح سے۔"

یہی بات ایک اور انداز میں وہ اپنے مشہور زمانہ خطبات مدراس میں یوں کہتے ہیں۔

"تاریخ کے سفر میں اسلامی اخلاقیات، معاشرت، اسلامی آئیڈیلز مقامی اثرات اور مسلمان اقوام کے زمانہ قبل از اسلام کے توہمات کے زیر اثر آہستہ آہستہ DE-ISLAMIZE

ہو چکے ہیں، ہمیں اس زنگ کو اس پر سے کھرچ کر علیحدہ کرنا، اسے متحرک کرنا اور درخشاں قومی ہیئت دینی ہے ـــــ"

ایک اور اقتباس ہے۔ "اسلامی نقطۂ نگاہ سے مملکت اس کوشش کا نام ہے جس کی رُو سے اسلام کے مثالی تصورات کو زمان و مکان کی قوتوں میں منتقل کیا جاتا ہے، یہ درحقیقت ان بلند تصورات کو انسانی ہیئتِ اجتماعیہ میں منتقل کرنے کا نام ہے ـــ"

اقبال فلاسفر تھے، انہوں نے فلسفے کی زبان استعمال کی ہے۔ قائد اعظمؒ پریکٹیکل سیاست دان تھے، انہوں نے یہی بات زیادہ سلیس، زیادہ سادہ، زیادہ سیدھے (ڈائریکٹ) انداز میں کہی اور ان کا یہ قول ایسا واضح ہے کہ ہمیشہ ہر ایک صاحبِ اقتدار کے سامنے رہنا چاہیئے اور جو ایک راہنما قول بھی ہے ـــــ

"اسلامی حکومت میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں، اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی نہ کسی شخص یا ادارہ کی، قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں، اسلامی حکومت دوسرے معنوں میں قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔"

لیکن قائد اعظمؒ کی وفات کے بعد ہم نے ان کے فرمودات سے یکسر روگردانی اختیار کی کیونکہ ہم رفتہ رفتہ ان کے دام میں آگئے جو کہتے تھے

"ہم ڈاکٹر صاحب کو ایک شاعر اور فلسفی سے زیادہ حیثیت دینے کو شرعی جرم سمجھتے ہیں۔"

(نجم الدین اصلاحی، بحوالہ زندہ رود، جلد ۳ ص ۲۷۰)

بلکہ ہم نے تو اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر ان لوگوں کو اسلام کے سکالر اور ہیرو بنانا شروع کر دیا جن کی تعبیرِ شریعت کو جمہور اسلامیانِ ہند نے رد کر کے اقبال اور ان کے ہمنواؤں کی تعبیرِ شریعت اور تشکیلِ معاشرت و نظامِ حکومت کو اختیار دیا تھا۔

اقبالؒ نے فرمایا تھا۔

"ISLAM IS NOT A CHURCH. IT IS A STATE CONCEIVED AS A CONTRACTUAL ORGANIZATION ـــ"

لیکن ہم نے اسے ایک چرچ ہی کی حیثیت دے دی، حاملانِ جُبّہ و دستار کو جو اسلام کی روایتی اور فقہی تعبیروں کے علمبردار تھے، اقبال کی اجتہادی سوچ کے مخالف تھے، انہیں سرکار، دربار کے ہر بڑے فنکشن میں اگلی صفوں میں بٹھا کر،

مگر ہم نے سیادت کانفرنسیں اور سیمنار، محافلِ قرآت و محافلِ نعت برپا کر کے یہ باور کرایا کہ ہم نے مذہب کو بہت پذیرائی دی ہے "ہم مذہب کے بڑے شیدائی اور علمبردار ہیں"۔۔۔ معاشرتی ذمہ داریوں اور اسلام کے انقلابی رخ سے منہ موڑ لیا۔

یوں تو ہم آج بھی ریڈیو، ٹی وی سے قائداعظم کا ایک آدھ فرمان سُن، پڑھ لیتے ہیں مگر وہ اسی قسم کے پیغام ہوتے ہیں کہ اپنے اندر اپنے اسلاف کا ساجذبہ پیدا کرو، کبھی کسی نے ان کے ایسے پیغامات کی طرف توجہ نہیں دلائی جن میں اسلام کے عمرانی عدل پر مبنی سوسائٹی کے قیام پر زور دیا گیا ہو، قائداعظم کے سٹیٹ بنک کے افتتاح پر کی گئی تقریر جس میں انہوں نے امت پہ اسلام کے اپنے منفرد معاشی نظام کی طرف توجہ دلائی تھی کبھی ٹی وی پہ دکھائی نہیں دیتی۔۔۔
ریڈیو ٹی وی سے کبھی آپ نے سُنا کہ علامہ اقبالؒ نے کبھی یہ بھی کہا تھا،

پرانی سیاست گری خوار ہے ، زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

کبھی ٹی وی سکرین پہ ایسے اشعار دیکھے۔

جو حرف قل العفو میں پوشیدہ تھے اب تک
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

اقبال ڈے پر بڑے بڑے سکالر دکھائے جاتے ہیں مگر ان میں سے کبھی کسی نے اقبال کا یہ پیغام بھی سنایا کہ

باطن الارض ﷲ ظاہر است
ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است

بلکہ اقبال کو کافر کہنے والوں کے پیروکاروں کی مقدس زبان سے شرع اور نفاذِ شریعت کے بلند بانگ دعاوی سننے رہتے ہیں، کوئی نہیں بتاتا کہ اقبال نے بھی شرع کے نفاذ پہ زور دیا تھا مگر وہ شرع

نکتۂ شرع مبیں ایں است و بس
کس نہ باشد در جہاں محتاج کس

بیچارے اقبال کا کیا ذکر، ہم نے تو قرآنِ پاک کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا ڈھنگ بھی نکال لیا۔۔۔ رکوع و تسبیح، زکوٰۃ و صدقہ و خیرات والی آیات تو موقع دیکھ کر ذکر کرتے ہیں مگر کبھی الارض ﷲ، لیس للانسان الا ما سعٰی یا یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو والی آیات کی نہ تلاوت کرتے ہیں نہ کبھی ان کا مفہوم بتاتے ہیں۔۔۔
دینی پروگراموں میں قضا نمازوں کو ادا کرنے کے سوالوں کا ذکر ہوتا ہے، ایک طلاق اور تین طلاقوں کا، منہ سے نکلی ہوئی گالی کے کفارے پہ سوال تو ہوتے ہیں، کبھی یدع الیتیم اور طعام مسکین کے اہتمام کا ذکر نہیں ہوتا، مساواتِ انسانیہ کا ذکر کہیں نہیں ہوتا۔۔۔

بلکہ ایسے ڈرامے اور پروگرام بھی مذہبی کہہ کر دکھائے جاتے ہیں جن میں پختہ تر کردہ مزاج خانقاہی ہیں اسے' کا عملی درس ہوتا ہے ـــــ

ہمارا المیہ یہی ہے کہ ہم نے اپنے فکری رہنماؤں سے کنارہ کشی اختیار کر لی ـــــ

جب ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے اور حلقوں اور بہت سے اور پاکستان کی بہتری چاہنے والوں کی بھی یہی رائے ہے تو ہمیں بہت تقویت حاصل ہوتی ہے' ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے جریدہ المعارف' اقبال نمبر نومبر دسمبر ۹۲ء کا یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔

"علامہ اقبال دنیائے اسلام کی ان چند ممتاز شخصیات میں سے ہیں جو عہدِ حاضر میں مسلمانوں کے لئے مسیحا بن کر آئے تھے انہوں نے مشرق و مغرب کے فلسفہ ہائے حیات کا وسیع مطالعہ کیا تھا' قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی' انہوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ اسلام کی قانونی' سیاسی' ثقافتی' تہذیبی اور تاریخی زندگی کے مطالعے میں بسر کیا تھا' اس ساری فکری کشمکش اور جدوجہد کا جس میں ان کی زندگی کی راتیں گزری تھیں ایک ہی مقصد تھا اور وہ یہ کہ انسانی وقار کو کیوں کر بحال کیا جائے اور مسلم سوسائٹی کی تشکیل جدید کن خطوط پر کی جائے جس میں انسان' انسان کا غلام نہ رہے اور وہ ایسے نظام سے چھٹکارا پا سکے جس کا خمیر' جبر و تشدد اور استحصال سے اٹھتا ہے ـــــ

اخلاص اور سنجیدگی سے ہماری رائے ہے کہ ہمیں اپنی بھولی ہوئی راہ کا سراغ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کے افکار اور آرا میں مل سکتا ہے' ہم سیاسی و اجتماعی میدان میں اقبالؒ اور جناحؒ کی راہوں کو چھوڑ کر برابر ٹھوکریں کھا رہے ہیں اور آج نسلی' لسانی اور مذہبی فرقہ واریت کی جس راہ پر چل نکلے ہیں وہ حجاز نہیں ترکستان جا رہی ہے' نئے المیے سے بچنے کے لئے ہمیں اقبال اور قائد کے افکار کی روشنی میں بڑی بے رحمی سے اپنا محاسبہ کرنا ہوگا اور ایک صحت مند نظام کے قیام کے بعد ہی ہم معاندانہ طاقتوں کو شکست دے سکتے ہیں جو ہماری اجتماعی اور سیاسی زندگی کو تہہ و بالا کرنے پر تلی بیٹھی ہیں ـــــ"

رُوئیداد

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۹۳ء

پاکستان کے تاریخی شہر اور صوبہ پنجاب کے دارالحکومت 'لاہور' کو، جسے پاکستان کی تاریخ میں قرآنی فکر و نظر کی سالانہ کنونشن منعقد کرنے کا اعزاز حاصل رہا ہے، اس بار بھی اس اجتماع کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔ ۷ اپریل کا سورج ڈھلتے ہی کنونشن کے مندوبین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا جو اگلی صبح تک جاری رہا۔ خلیج فارس سے لے کر بنوں اور کوہاٹ اور ریاست سوات سے لے کر کراچی تک مختلف مقامات کی بزموں کے نمائندگان اور مدعوین دور دراز کی منزلیں طے کر کے محض اس جذبے کے ماتحت یکجا جمع ہوئے تھے کہ یہ سوچا جائے کہ اللہ کی کتاب کی تعلیم کو عام کرنے کے لئے کیا کیا مؤثر ذرائع اختیار کئے جائیں۔ شمع قرآنی کے ان پروانوں میں حسبِ سابق انجنیئر بھی تھے اور پروفیسر بھی، ڈاکٹر بھی تھے اور ایڈووکیٹ بھی، شہروں کے مخلص مزدور بھی تھے اور دیہات کے پاکیزہ فطرت کسان بھی ــــ ان میں کوٹ پتلون والے صاحب بہادر قسم کے دردمند انسان بھی تھے اور صاحبِ عزم تہبند پوش بھی۔ ان سب کے دلوں میں قرآنی فکر کی شمعیں جگمگا رہی تھیں اور ان کی روحیں اخوت کی والہانہ تڑپ سے مالا مال تھیں۔ باہمی ربط و ضبط کی مخلصانہ کشمکش کے لازوال رشتے میں ہم آویز کئے ہوئے تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے قرآنی درس گاہ اثر انگیز فضا میں وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔

کنونشن کا پہلا اجلاس باہمی تعارف کے سلسلہ میں تھا جس میں مندوبین اپنے اور اپنے رفقاء کے ساتھ طلوعِ اسلام کی کشتِ نو بہار کی روئیداد بیان کر رہے تھے۔ وہ کشتِ نو بہار جسے انہوں نے سنگلاخ زمینوں میں اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا۔ اس مجلس میں احباب صحیح معنوں میں ایک دوسرے سے باضابطہ طور پر روشناس ہوتے رہے۔ تلاوتِ قرآن پاک و کلامِ اقبالؒ کے بعد تعارف کا باہمی سلسلہ دراز شروع ہوا جس میں بزمِ ایبٹ آباد، ایبٹ آباد خواتین، بورے والا، چک ۲۱۵/EB، چنیوٹ، چوٹی زیریں، فیصل آباد، گوجرانوالہ، جلال پور جٹاں، جہلم، کراچی، کراچی صدر، لاہور، لاہور خواتین، لاہور چھاؤنی، پنج کسی، پشاور، پشاور افغان کالونی، پیر محل، راولپنڈی،

سرگودہا، سیالکوٹ کے نمائندگان کے علاوہ کویت سے جناب عبیدالرحمان ارائیں نے حاضرین سے خطاب فرمایا۔ یہ اجلاس ایک بجے بعد دوپہر اور پھر نو (۹) بجے شام سے ۱۱ بجے شب تک جاری رہا۔ رات بہت ہو چکی تھی لیکن خمخانۂ قرآن کے ان سرمستوں کی آنکھوں میں نیند کہاں؟ وہاں سے اٹھے تو کیمپ میں جگہ جگہ چھوٹی چھوٹی محفلیں جم گئیں۔ یہ سلسلہ کم و بیش ساری رات جاری رہا۔

کنونشن کا پہلا کھلا اجلاس ۳ بجے بعد دوپہر شروع ہوا۔ اربابِ فکر و نظر، قرآنی فکر سے وابستہ دانشوروں کو اظہارِ خیال کی دعوت دی گئی تھی، اس بار جو موضوع انہیں دیا گیا تھا، غالب کا یہ فکر انگیز شعر تھا،

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

سٹیج سیکرٹری کے فرائض محترم عمر دراز صاحب کے ذمہ تھے۔ اس اجلاس کی صدارت کے لئے کویت سے آئے ہوئے مندوب جناب عبیدالرحمٰن ارائیں صاحب کو دعوت دی گئی۔ صاحبِ صدر کرسیٔ صدارت پر تشریف فرما ہوئے تو اجلاس کی باقاعدہ کاروائی تلاوتِ کلامِ پاک سے شروع ہوئی۔ تلاوت اور اس کے بعد مفہوم سنانے کی سعادت محترمہ ثریا عندلیب کے حصے میں آئی۔ تلاوت کے بعد محترم فضل داد صاحب نے کلامِ اقبال پیش کیا۔

پہلا خطاب بھی محترمہ ثریا عندلیب ہی کے حصے میں آیا، انہوں نے اپنے مخصوص عالمانہ انداز میں ان عوامل پر روشنی ڈالی جو امت کے زوال کا سبب بنے اور بن رہے ہیں، دین اور مذہب کے بین فرق پہ روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے اپنا مافی الضمیر کھل کر بیان کیا۔

یہی فرق بریگیڈیئر اعزاز الدین احمد صاحب کے مقالے کا نقطۂ ماسکہ تھا، انہوں نے دین کے رستے کی طرف آنے والوں کو روکنے والی دیوار مذہبی پیشوائیت کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی۔

ان دو مقالوں کے درمیان فکرِ قرآنی سے وابستہ پروفیسر صالحہ غنی نے فکر اور تخلیقی سرگرمی سے عاری معاشرے کے کھوکھلے پن پر لیکچر دیا، ان کا انداز مقالہ پڑھنے کا نہ تھا، نہ ہی لکھا ہوا مقالہ غالباً ان کے سامنے تھا، مگر انہوں نے سمجھانے کے انداز میں اپنے پوائنٹس پر بڑی واضح تقریر کی۔

بریگیڈیئر صاحب کے بعد بزرگ دانشور ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب نے اپنا مقالہ پیش کیا جو دراصل ناروے سے آئے ہوئے ایک استفسار کا جواب تھا جو انہیں اسی مسئلے پر روشنی ڈالنے کی دعوت تھی ــــ ہیں آج کیوں ذلیل ــــ ڈاکٹر صاحب نے اپنے نقطۂ نظر سے سوال کرنے والوں کے ساتھ حاضرین کو بھی مستفید فرمانے کی غرض سے اپنے جواب کو مقالے کی شکل میں ڈھال دیا تھا۔

اس کے بعد جناب عبداللہ ثانی نے اپنے مخصوص انداز میں معاشرے میں موجود منافقانہ رویوں پر روشنی ڈالی، روزمرہ کے واقعات کی مثالیں دے کر انہوں نے اپنے نقطۂ نظر کو حاضرین تک پہنچایا، حاضرین نے کھل کر انہیں داد دی۔

اس کے بعد ڈاکٹر صلاح الدین اکبر نے اپنا مقالہ پیش کیا، انہوں نے اس شعر کا اطلاق صرف امتِ مسلمہ پر نہیں خود حضرتِ انسان پر کیا اور اس کے دعوئے ہائے ترقی کا پول کھولا اور واضح کیا کہ وحی کی روشنی اور اس کے بنائے ہوئے رستے پر چلے بغیر انسان کی ترقی ایک سراب ہے اور اس کا نتیجہ وہ فساد فی الارض ہے دنیا آج جس کا شکار ہو رہی ہے اور سائنس کی ترقی اسے فساد فی الارض سے فساد فی الکائنات بنانے پر تلی بیٹھی ہے۔ اسی فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے محترمہ شمیم انور صاحبہ نے حاضرین سے انگریزی زبان میں خطاب کیا

تین بجے شروع ہوئی یہ مجلس آٹھ بجے کے قریب سرائے عالمگیر سے آئے مندوب زین العابدین صاحب کے مقالے پر ختم ہوئی۔

ہر چند نشست طویل تھی مگر مقالوں میں دل چسپی کی بنا پر حاضرین تعداد اجلاس ختم ہونے تک اتنی ہی تھی جتنی شروع ہونے پر۔ وقت کی تنگی کے باعث متعدد حضرات کے مقالے جن میں حنیف وجدانی، علی محمد چدھڑ، محمد ارشاد وغیرہ شامل ہیں پیش نہ کیے جا سکے۔

اجلاس کے اختتام پر جناب عبداللہ ثانی صاحب نے صدارتی کلمات اپنے مخصوص ہلکے پھلکے انداز میں پیش کیے اور آخر میں صاحبِ صدر جناب طارق عزیز صاحب کھڑے ہوئے۔ پہلے تو انہوں نے اپنی خرابیٔ صحت اور ڈاکٹر کی ہدایات کا ذکر کیا مگر جب بات کرنے پہ آئے تو "رکتی ہے میری طبع تو ہوتی ہے رواں اور" کا نقشہ دیکھنے میں آیا۔ بچپن میں مذہب سے اپنی والہانہ دل چسپی سے شروع ہو کر پرویزؒ صاحب سے اپنے تعارف اور پھر مولانا حضرات کو پرویزؒ صاحب کے کیسٹ سنانے کے تذکرے ہوئے۔ مذہبی پیشواؤں اور کمیونسٹوں کے متشدد اور بے لچک رویوں سے لے کر خود ساختہ علماء کے کھوکھلے دعاوی کا ذکر ہوا اور بالآخر ملا کی مخالفت کو اپنی فکر کے مبنی برحق ہونے کی دلیل قرار دیتے ہوئے پرویزؒ صاحب کی جلائی ہوئی قرآنی فکر کی شمع تابندہ کو برومند دیکھنے کی حسین تمناؤں کے ذکر پر انہوں نے اپنی مختصر مگر جامع تقریر ختم کی۔

آخر میں قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کی دعوت پر حاضرین مجلس قرآنک ریسرچ سنٹر کا سنگِ بنیاد رکھنے کی تقریب میں شمولیت کے لئے برلبِ نہر، پنجاب یونیورسٹی کے قریب اس مقام پر تشریف لے گئے جہاں طلوعِ اسلام کالج اور قرآنک ریسرچ سنٹر کی تعمیر کے لئے زمین حاصل کر لی گئی ہے۔

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۹۳ء — پہلا کھلا اجلاس

موضوع۔ ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

زیرِ صدارت جناب عبید الرحمٰن ارائیں صاحب۔ ساتھ ناظم ادارہ محمد لطیف چوہدری تشریف فرما ہیں۔

سٹیج سیکرٹری کے فرائض جناب محمد عمر دراز صاحب ادا فرما رہے ہیں۔

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۹۳ء

کھلا اجلاس

اوپر محترمہ ثریا عندلیب صاحبہ اسبابِ زوالِ امت بیان فرما رہی ہیں جب کہ نیچے بریگیڈیر (ریٹائرڈ) جناب اعزاز الدین خان صاحب امتِ مسلمہ کی کوتاہیوں کی نشاندہی کر رہے ہیں۔

طلوع اسلام کنونشن ۱۹۹۳ء

اوپر ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب ملّت کی نبض پر ہاتھ رکھے ہوئے ہیں جبکہ نیچے محترم عبداللہ ثانی صاحب اپنی مخصوص بذلہ سنجی سے موضوع پر اظہارِ خیال فرماتے ہوئے محفل کو کشتِ زعفران بنا رہے ہیں۔

طلوعِ اِسلام کنونشن ۹۳ء
ہمہ تن گوش

طلوعِ اسلام کنونشن میں شریکِ سامعین کے دو مناظر

طلوعِ اسلام کنونشن ۹۳ء

استاد اور شاگرد

استاذہ کی نمائندہ محترمہ صالحہ نغمی اپنے مخصوص اندازِ بیان کے ساتھ ←

طالبہ عروج قاسم اپنے تصور کے پاکستان پر اپنی نظم پیش کر رہی ہیں

قرانک ایجوکیشن سوسائٹی کے زیر اہتمام ڈان ماڈل سکول جس کا افتتاح پچھلے سال کنونشن کے موقع پر کیا گیا تھا اس سکول کے بچے مندوبین کے سامنے قومی نغمہ پیش کر رہے ہیں۔

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۹۳ء

بزمِ مذاکرہ

موضوع : ہر سینے میں اک صبحِ قیامت ہے نمودار — افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا!

زیرِ صدارت : جناب طارق عزیز صاحب

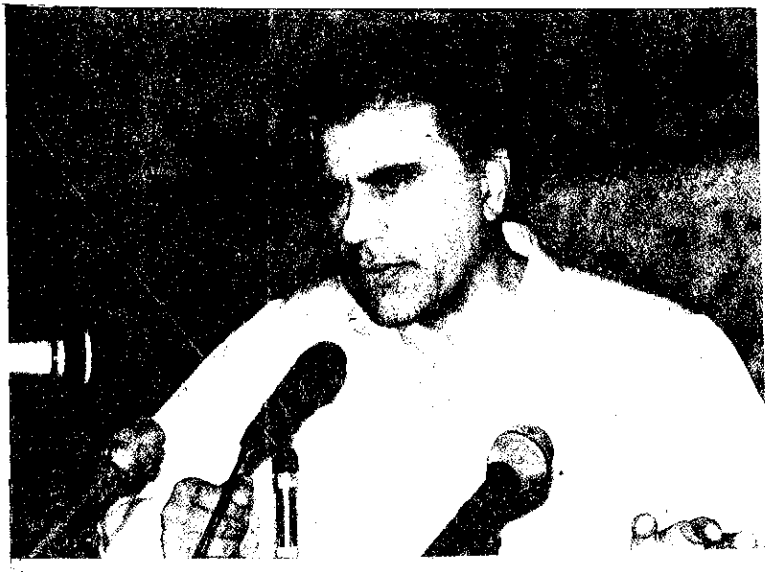

اوپر جناب طارق عزیز صاحب بحیثیت صدرِ مجلس حاضرین سے خطاب فرما رہے ہیں۔ نیچے اس مجلس کے کمپیئرز ڈاکٹر صلاح الدین اکبر اور ناظمِ ادارہ محمد لطیف چوہدری مصروفِ کار ہیں۔

۹ اپریل ۱۹۹۳ء۔ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی نے "قرآنک ریسرچ سنٹر" کے ایڈمنسٹریشن بلاک کا سنگ بنیاد رکھا۔ مفکرِ قرآن علامہ غلام احمد پرویزؒ کے خوابوں کی تعبیر کی طرف ایک اور قدم۔

سنگِ بنیاد کی نقاب کشائی کی تقریب کی تصویری جھلکیاں جس میں اراکین ایجوکیشن سوسائٹی کے علاوہ کنونشن کے مندوبین کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔

کویت میں

جشنِ نزولِ قرآن

(زیرِ اہتمام ـــــ بزمِ طلوعِ اسلام کویت)

بزمِ طلوعِ اسلام کویت نے جشنِ نزولِ قرآن کی فرحتوں کو دوبالا کرنے کے لئے عید الفطر کے پر مسرت موقع پر سفارت خانہ پاکستان کے قائداعظم آڈیٹوریم میں مورخہ ۲ اپریل شام ۷ بجے عید ملن پارٹی کا اہتمام کیا جس میں زندگی کے مختلف شعبوں سے منسلک کویت میں مقیم پاکستانیوں کی ایک کثیر تعداد نے شرکت فرمائی۔ تقریب کے انعقاد کے لئے چونکہ جگہ محدود تھی۔ لہٰذا اس میں شمولیت کے لئے دعوت نامے جاری کئے گئے تھے۔ کوشش کی گئی تھی کہ تمام مکاتبِ فکر سے تحریکِ طلوعِ اسلام کے بہی خواہ افراد کو متوازن نمائندگی دی جا سکے۔ اس اصول کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سفارت خانہ پاکستان اور دیگر مقامی اداروں میں کام کرنے والے محنت کشوں، ڈاکٹروں، انجینئروں، صحافیوں ادبی شخصیات اور سماجی کارکنوں میں سے چیدہ چیدہ افراد کو مدعو کیا گیا تھا۔ بزم کے تمام اراکین نے مہمانوں کا نہایت پُرتپاک خیر مقدم کیا۔ مہمانوں کی آمد کا سلسلہ سات بجے سے شروع ہو کر آٹھ بجے تک جاری رہا۔ سفارت خانہ کے صدر دروازے سے لے کر ہال میں مطلوبہ نشست تک مہمانوں کی رہنمائی کے لئے تحریک کے کارکن صف بستہ تھے۔

اس تقریب کی نمایاں شخصیت سفیرِ پاکستان جناب کرامت اللہ غوری تھے۔ علاوہ ازیں جو دیگر ممتاز شخصیات اس محفل کی رونق بنیں وہ یہ ہیں:۔

کویت میں تعینات پاکستانی افواج کے کمانڈر بریگیڈیئر ہمایوں خاں اور کرنل عبدالرشید صاحب، ممتاز سفارت کار جناب ترین صاحب، زیادخاں صاحب، غلام رسول ملک صاحب، اقبال ہادی زیدی صاحب، میاں فیاض صاحب اور میاں محمود صاحب، کویت ٹیلی ویژن کے نیوز ایڈیٹر جناب عبدالستار غزالی صاحب، عرب ٹائمز کے سینئر سٹاف رپورٹر جناب واجد علی واجد صاحب، معروف بزنس مین جناب زاید بٹ صاحب، سینئر بنکار جناب سلیم پرویز صاحب، مشہور سماجی کارکن دین حسن ہنگش صاحب، پاکستانی سکول کے پرنسپل جناب بشیر ملک صاحب، انجینئر مظفر علی صاحب، انجینئر

ذوالفقار شاہ صاحب اور ڈاکٹر ریاض سُمیر صاحب۔ اس تقریب کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مہمانوں کو تحریکِ طلوعِ اسلام کے مقصد و مسلک سے متعارف کرایا جا سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ایک تو یہ کیا کہ طلوعِ اسلام کے مقصد و مسلک کو قرآنِ کریم کی آیات سے مزین کر کے کتابچہ کی شکل دی اور دوسرا یہ کہ طلوعِ اسلام کے گذشتہ شماروں میں سے مختلف موضوعات مثلاً احادیث، فرموداتِ قائداعظمؒ اور اقبالؒ، شرک، تفرقہ اور دو قومی نظریہ سے متعلق زریں اقوال قائداعظمؒ کا پرویزؒ صاحب کے نام مکتوب وغیرہ کو لے کر رنگین ہینڈ بل چھپوائے اور ان سب کو مہمانوں میں تقسیم کیا، جن کا نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ مہمانوں کی ضیافت کے لئے کھانے پینے کا بندوبست بھی نہایت عمدہ تھا جسے کافی پسند کیا گیا۔ تقریب رات گیارہ بجے اختتام کو پہنچی۔

ناپید ترے بحرِ تخیّل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تیری آہوں کے شرارے

حدی خوانانِ قرآنی رہگذارِ کویت میں انجمن آرا ہیں

اعزاز الدین احمد خان۔ لاہور چھاؤنی

تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

تمہید

ہم یہ دعویٰ بڑے فخر سے کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ضابطۂ حیات (القرآن) اپنی آخری، مکمل اور محفوظ ترین شکل میں ہمارے پاس موجود ہے، لیکن اس ضابطۂ حیات کے اس دعویٰ کا ذکر اتنے زور و شور اور جذبے سے نہیں کرتے جس کی صداقت پر یقین، ایمان کہلاتا ہے۔ قرآنِ کریم کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے الحق پر مبنی دین (نظامِ حیات) اس لئے بھیجا ہے لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ (۹/۳۳) تاکہ وہ انسانوں کے وضع کردہ ہر نظامِ حیات پر غالب آکر رہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا۔ اگرچہ اس وقت اس کے آثار اتنے واضح نہیں ہیں۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس قرآنی دعوے کو مان لینے یا کہہ دینے سے ایمان کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے؟ ایمان، اندھے یقین کا نام نہیں۔ قرآنی صداقتوں کو علم و بصیرت کی رو سے سمجھنے اور غور و فکر کے بعد تسلیم کرنے کا نام ایمان ہے (۲۵/۷۳)۔ بالفاظِ دیگر ایمان چار لفظوں کو دہرا دینے کا نام نہیں ہے۔ یہ دل کی تبدیلی کا نام ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ ذلت و خواری کا اصل سبب، میری ناقص رائے میں، یہی ہے کہ یہ "دل کی تبدیلی" ہمارے اندر ابھی تک پیدا نہیں ہوئی ہے۔ یعنی ایمان ہمارے دل کی گہرائیوں میں ابھی تک نہیں اُترا ہے۔ اس وقت ہماری حالت ان اعراب (بدوؤں) جیسی ہے جن کا ذکر قرآنِ حکیم نے سورۂ حجرات میں کیا ہے (۱۴/۴۹)۔ ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیئے، "آئینۂ ایام" میں اپنی "ادا" دیکھنی چاہیئے۔ بقول اقبالؒ اپنے آپ سے پوچھنا چاہیئے کہ "تم سبھی کچھ ہو، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو؟" یہی سوال میرے مقالے کا موضوع ہے۔

صدرِ اوّل کے بعد

اسلام کے صدرِ اوّل میں مسلمان کچھ عرصہ تک اس اسلام پر کاربند رہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے قرآنِ حکیم کو چھوڑا تو نہیں، اسے سینے سے لگائے رکھا، اسے سر پر اٹھائے رکھا، انہوں نے کیا یہ کہ اسے مہجور (۲۵/۳۰) بنا دیا۔ یعنی انہوں نے اپنے آپ کو قرآن کے تابع رکھنے کے بجائے اسے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ دیا! انسانوں کی دی ہوئی تعلیم کے پیچھے چلنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا دین جو قرآن کے اندر تھا، گم ہو گیا اور مسلمان اپنی اپنی خود ساختہ روشوں پر چل دیئے۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس طرح ہم نے دین کی جگہ مذہب اختیار کر لیا۔ اس نہج سے ہم بھی اقوامِ سابقہ کی سطح پر آ گئے، اس فرق کے ساتھ کہ دین کا ضابطہ (قرآنِ حکیم) اپنی اصلی شکل میں ہمارے پاس محفوظ ہے۔ کیونکہ اس کی حفاظت کا ذمہ اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے (۱۵/۹) لیکن اس کتاب (القرآن) کا محفوظ رہنا مذہب کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔ چنانچہ اس نے اسے قوم کی زندگی سے عملاً خارج کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس نے کیا یہ کہ قرآن کا اسلام مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل کر کے "مذہبِ اسلام" ان کے سامنے رکھ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ

دنیا بھی ہاتھ سے گئی۔ ذلت و ابتری ہمارا مقدر بن گئی۔

آج مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کی صف میں انہیں کوئی قابلِ عزت مقام ہی حاصل نہیں۔ ان کی قسمت کے فیصلے غیروں (کفار) کے رحم و کرم پر موقوف ہیں۔ آج کفار حرم کے پاسبان بنے بیٹھے ہیں! لیکن ہم ذرا نہیں سوچتے کہ قرآنِ حکیم نے تو کہا تھا کہ مسلمانوں کا امتیازی نشان "اعلون" ہے۔ آج ہم مغلوب کیوں ہیں؟ آج کے مسلمانوں کو تو اپنے آپ کو اسلام کے ساتھ منسوب کرنے سے بھی شرم آنی چاہیئے کہ ان کی وجہ سے دنیا میں اسلام جیسا مہرِ عالمتاب گہن میں آ رہا ہے۔ کس قدر الم انگیز ہے یہ حقیقت جسے زبان و قلم کے بجائے خون کے آنسوؤں ہی سے بیان کیا جا سکتا ہے۔ ذرا تصور میں لائیے صدرِ اوّل کی جماعتِ مومنین کے کردار کی بلندی جس سے اقوامِ عالم کی امامت انہیں حاصل ہو گئی اور آج مسلمانوں کی یہ ذلت و پستی، محکومی و محتاجی، بے کسی و بے بسی، غربت و افلاس۔ ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر (اقبالؒ)

اقبالؒ کے نزدیک مسلمانوں کی پستی و ابتری، غربت و افلاس کی وجہ دولت یا وسائل کی کمی نہیں، ایمان کی کمی ہے۔ وہ کہتا ہے:

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں!

وہ قوم کو جھنجھوڑتا ہے۔ ؎

ترے دریا میں طوفاں کیوں نہیں ہے
خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے؟

قرآن، "خودی کے مسلمان ہونے" کو ایمان سے تعبیر کرتا ہے۔ علامہ کا فلسفۂ خودی ایمان ہی کی تفسیر ہے۔ اگر ایمان ہمارے دل کی گہرائیوں میں اترا ہوتا تو آج مسلمانوں پر کفار (غیر مسلموں) کا سیاسی اور معاشی غلبہ نہ ہوتا۔ "اعلون" سے یہی مراد ہے (۳/۱۳۸)۔ اگر آج مسلمان "اعلون" اور "غالبون" (۵/۵۶) کے مناصبِ جلیلہ پر فائز نہیں، اگر آج مسلمانوں سے "خیر الامت" (۳/۱۰۴) کا مقامِ بلند چھن چکا ہے تو یہ اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ ہم مومن نہیں رہے، مسلم نہیں ہیں۔ یعنی ہم قرآنی مسلمان نہیں رہے۔

لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس قرآنی فیصلے کے باوجود ہمارا اصرار ہے کہ ہم "اہلِ ایمان" ہیں اور اللہ کے ضابطۂ حیات (القرآن) کے ایک ایک لفظ پر ایمان رکھتے ہیں۔ خود فریبی اور خدا فریبی (نعوذ باللہ) کا یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے لیکن ہماری حالت نہ بدلنی تھی اور نہ بدلی اور بدلے بھی کیسے، مذہبی پیشوائیت ہمیں برابر اس خود فریبی میں مبتلا رکھے چلی آ رہی ہے کہ اِس دُنیا کی ذلّت، جنّت اُخروی کی ضمانت ہے۔ قرآن پر ایمان کی دلیل یہ قرار دی گئی کہ اِسے تعویذوں، وظیفوں، ٹوٹکوں اور استخاروں کے لئے استعمال کیا جائے، اس پر غور و فکر کی قطعاً ضرورت نہیں۔ جو غور و فکر ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب ہمارا کام یہ ہے کہ اس کی ناظرہ تلاوت کرتے رہیں، ورد اور ختم شریف کی مجلسیں سجاتے رہیں، اِسی سے آخرت میں بیڑا پار ہوگا۔ ہم یہی صدیوں سے کرتے چلے آتے ہیں لیکن ہماری حالت نہ بدلی۔ کسی بندۂ خدا نے اس صاف اور واشگاف سبب پر توجہ نہیں دی کہ ہمارے معاشرے کا سارا بگاڑ، ہماری ذلّت کا اصل سبب تو اللہ کی مقدّس کتاب کے ساتھ مسلسل کھیل کھیلنے کی بنا پر ہے۔ ہماری حالت بدلے تو بدلے کیسے؟ اقبالؒ پکار اٹھتا ہے:

کر سکتی ہے بے معرکہ جینے کی تلافی
اے پیرِ حرم تیری مناجاتِ سحر کیا!

آج کے مسلمانوں کو چاہیئے کہ اپنی حالت بدلنے کے لئے قرآن کے اٹل اصول ــــ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ (یہ حقیقت ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی نفسیات کو نہ بدلے) ــــ کی روشنی میں اپنی موجودہ حالت کا جائزہ لے، اپنے فریضۂ حیات کو پہچانے اور پھر

اس کے حصول کے لئے جدّوجہد کرے۔ آیئے دیکھیں کہ قرآن نے مسلمانوں کا فریضۂ حیات کیا بتایا ہے؟

مسلمانوں کا فریضۂ حیات

قرآنِ حکیم نے مسلمانوں کا فریضۂ حیات " تُکَبِّرُوا اللّٰہَ " کی نہایت جامع اصطلاح سے سمٹا کر بیان کر دیا ہے۔ اس سے مراد اللہ کی کبریائی قائم کرنا ہے۔ اصل یہ ہے کہ " تُکَبِّرُوا اللّٰہَ " دین کی غایت اور جماعتِ مومنین (امّتِ مسلمہ) کا منشائے مقصود ہے۔ یہ امت جیتی ہے تو اسی کے لئے، اس کی تمام جدّوجہد ہوتی ہے اسی کے لئے اور مرتی ہے تو اسی کی خاطر ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بُتانِ آذری (اقبالؒ)

سورۂ جاثیہ میں ہے:

وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۴۵/۳۷)

"خارجی کائنات میں اور انسانی دنیا میں کبریائی صرف اللہ کی ہے، وہ انتہائی غلبہ کا مالک ہے۔ لیکن اس کا غلبہ حکمت پر مبنی ہے۔"

خارجی کائنات میں اللہ تعالیٰ کی کبریائی مسلّم ہے۔ جہاں تک انسانی دنیا کا تعلق ہے اس کے لئے بھی اللہ نے قوانین متعیّن کر دیئے ہیں جو اب قرآنِ حکیم میں محفوظ ہیں۔ ان قوانین کو، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، الدِّین کہا جاتا ہے۔ دنیا میں دین کے یہ قوانین از خود نافذ العمل نہیں ہوتے۔ یہ انسانی ہاتھوں سے نافذ ہوتے ہیں۔ ان قوانین کو انسانی دنیا میں نافذ کرنا اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو ثبت (ESTABLISH) کرنا کہلائے گا۔ ان کا نفاذ جماعتِ مومنین (اُمّتِ مسلمہ) کا فریضۂ حیات ہے۔ اس طرح جو نظام قائم ہوتا ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی حکومت یا دین کا نظام کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نظام میں بالادستی اللہ کے احکام و قوانین کو حاصل ہوگی۔ یہ قوانین خداوندی مکمّل بھی ہیں اور غیر متبدّل بھی۔ ان کے مجموعے کا نام قرآنِ حکیم ہے۔ لہٰذا، اللہ کی حکومت، اس کے غلبہ و تسلّط، اس کے اقتدارِ مطلق، اس کی کبریائی سے مراد ہوگا اللہ کی کتاب (القرآن) کی حکومت۔ اسی لئے فرمایا کہ:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝ (۵/۴۴)

یعنی جو کتاب اللہ (مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ) کی حکومت قائم کرتے ہیں انہیں مومن کہا جاتا ہے۔ جو ایسا نہیں کرتے وہ کافر کہلاتے ہیں۔

جب حکومت قرآنِ حکیم کے مطابق قائم ہوگی تو اسے الدّین یعنی نظامِ خداوندی کہہ کر پکارا جائے گا۔

حضرات انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد اسی دین کا قیام اور دیگر ادیان (نظام ہائے زندگی) پر اس کا غلبہ و استیلاء تھا۔ بعثتِ حضور نبی اکرمؐ اور نزولِ قرآن سے بھی یہی مقصد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کے لئے جو نظامِ زندگی (الدّین) متعین کیا ہے، وہ انسانوں کے بنائے ہوئے تمام نظاموں پر غالب آجائے۔

هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَ دِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝ (۹/۳۳)

"اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسولؐ کو حق پر مبنی نظامِ حیات اور ضابطۂ ہدایت دے کر بھیجا تاکہ وہ نظام، دنیا کے ہر باطل نظام پر غالب آجائے۔ خواہ یہ امر ان لوگوں پر کتنا ہی شاق کیوں نہ گزرے جو خالص قوانینِ خداوندی کی محکومیت پسند نہیں کرتے۔"

چونکہ یہی نظام ہے جو منشائے تخلیقِ انسانی کو پورا کرتا ہے یعنی اس کے تابع انسان وہ کچھ بن سکتا ہے جو کچھ بننے کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے، اسی لئے، آخر الامر اسے دیگر نظام ہائے حیات پر غالب آکر رہنا ہے۔

محمدؐ رسول اللہ والذینؓ معہٗ کے سامنے یہی مقصدِ حیات تھا۔ یعنی دین الحق، نظامِ خداوندی کو نظام ہائے عالم نے اپنے یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے چند سالوں کے عرصہ میں ایسا کر کے دکھا دیا۔ یاد رکھئے، صدرِ اوّل کی فتوحات، علاقوں اور ملکوں کی فتوحات نہیں تھیں۔ وہ انسانوں کے وضع کردہ نظاموں پر نظامِ خداوندی کی فتح تھی۔ وہ لیظھرہ علی الدین کلہ کا عملی مظاہرہ تھا۔ یہ مقصد (اس زمانے کے حالات کے مطابق) حضورؐ کے آخری ایام میں، پوری قوت اور غلبہ کے ساتھ پورا ہو گیا۔ دین کی تکمیل ہو گئی۔ نبوت ختم ہو گئی۔

اب دین میں پیش کردہ نظام کو تمام نظام ہائے عالم پر غالب آنا ہے۔ قرآنِ حکیم کے اس دعویٰ کو کہ دین خداوندی کو انسانوں کے وضع کردہ نظاموں پر غالب آکر رہے گا۔ اب ہم نے اور ہم سے بعد میں آنے والوں نے سچ ثابت کر کے دکھانا ہے۔ گویا بعثتِ رسولؐ اللہ اور نزولِ قرآن کے مقصد کا حصول اب ہماری ذمّہ داری ہے۔ کاش ہم سمجھیں۔ ظاہر ہے کہ ایسا اسلامی حکومت کے ذریعے ممکن ہو گا جسے امّت متشکّل کرے گی۔ یہ امّت کے ہر فرد کی ذمّہ داری ہے کہ ایسی اسلامی حکومت کی تشکیل کے لئے زمین ہموار کرتا رہے۔ یعنی اپنے آپ کو ایسا مسلمان بنائے جو قرآنی معیار پر پورا اترتا ہو۔ ایسا مسلمان جو اپنے دعویٰ ایمان کا ثبوت اپنے عمل سے پیش کرے جس کے قول و فعل میں ہم آہنگی ہو، تضاد نہ ہو۔ جب تک ہم ایسے مسلمان نہیں بنیں گے قرآنی معاشرے کا خواب ادھورا رہے گا، مذہبی پیشوائیت کا راج قائم رہے گا۔ یاد رہے کہ دینِ خداوندی کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ انہی کا وجود ہے۔ انہیں راستے سے ہٹائے بغیر ہم اپنی منزلِ مقصود نہیں پا سکتے (۹/۳۴)۔ ان کو اللہ کے راستہ سے ہٹانے کے لئے یہ سمجھنا ضروری ہے کہ یہ کام کیسے کرتی ہے اور چا آتی گیا ہے۔ آیئے دیکھیں۔

مذہبی پیشوائیت

خلافتِ راشدہ کے کچھ ہی عرصہ بعد، دین کا نظام ملوکیت میں تبدیل ہوگیا، امت میں ثنویت پیدا ہوگئی، دنیاوی امور حکومت کی تحویل میں آگئے اور امورِ شریعت علماء کی تحویل میں۔ اس سے آخری اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں آگیا۔ اور چونکہ یہ اپنے فیصلے کو "اپنا فیصلہ" قرار نہیں دیتے تھے، بلکہ اسے "اللہ اور رسولؐ" کا فیصلہ کہہ کر صادر کرتے تھے۔ اس لئے کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس سے سرتابی کر سکے۔ عوام کالبے پناہ ہجوم (اللہ اور رسولؐ کے نام پر مرمٹنے کے لئے) ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ اس سے ایسی تھیاکریسی (مذہبی پیشوائیت) وجود میں آگئی جس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔

اُمتِ مسلمہ کا فریضۂ حیات دُنیا میں دینِ خداوندی کا غالب کرنا تھا۔ مذہبی پیشوائیت نے اس مقصد کو مسلمانوں کی نگاہوں سے اوجھل کر کے، انفرادی نجات کو مقصودِ زندگی قرار دے دیا۔ اسے کہتے ہیں دین کو مذہب سے بدلنا۔ نزولِ قرآن سے پہلے جتنے مذاہب تھے اُن کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ وہ اپنے آغاز میں دین تھے، شکست خوردہ قوتوں نے انہیں بعد میں مذہب میں تبدیل کر دیا۔ یہی کچھ اسلام کے ساتھ ہوا۔ ہمارا موجودہ اسلام منزل من اللہ دین نہیں، بلکہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے اور مذہب کوئی بھی ہو، اس میں زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔

مذہب، خدا اور بندے کے درمیان پرائیویٹ، انفرادی تعلق کا نام ہے، جسے ہر شخص اپنے اپنے طریق سے ہر جگہ قائم کر سکتا ہے۔ اور مقصد اس سے اپنا اطمینان حاصل کرنا یا اس سے بڑھ کر اپنی نجات ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، دین ایک اجتماعی نظام کا نام ہے۔ اس میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت بھی اجتماعی حیثیت سے ہوتی ہے اور اس کے نتائج بھی اجتماعی حیثیت سے سامنے آتے ہیں۔ اسی لئے قرآنِ حکیم نے دین کے قیام کے لئے امت کا وجود لازمی قرار دیا ہے۔ اسی لئے اُس نے مومنین کو امت کہہ کر پکارا ہے۔

جب مسلمانوں کا مقصدِ حیات بدل گیا تو دین کا تصور بھی ہمارے سامنے نہ رہا۔ اب ہمارے علماء کرام کا فریضۂ زندگی نظامِ خداوندی کو دیگر نظامات پر غالب کرنا نہ رہا بلکہ دیگر مذاہب کے مقابلہ میں "مذہب اسلام" کی افضلیت ثابت کرنا رہ گیا۔ اتنا ہی نہیں بلکہ خود ان کے اندر، مختلف فرقوں کے نزدیک اسلام کی خدمت یہ قرار پائی کہ دوسرے فرقوں کے مسلک کے مقابلہ میں اپنے فرقے کے مسلک کی برتری ثابت کریں۔ اس برتری کو ثابت کرتے کرتے ان میں سر پھٹول بھی ہوتی رہتی ہے۔ ملک کے اندر بھی اور ملک کے باہر بھی۔

ہماری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ ان حضرات (مذہبی پیشواؤں) نے کسی حکومت کو بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیا۔

جب تک حکومت اُن کے ساتھ ساز باز رکھتی، یہ اس کے ہر فیصلے کو "اللہ اور رسولؐ" کا فیصلہ قرار دیتے، جونہی اس سے کوئی اختلاف ہوتا، یہ "اللہ اور رسولؐ" کے نام پر عوام کو اس کے خلاف اُٹھ کھڑا کرتے۔ یہی کچھ آج تک ہو رہا ہے۔ اقبالؒ نے سچ کہا تھا۔

زوالِ بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

اس کے زوال کا اصل سبب مذہب ہے جس نے دین کا اجتماعی تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل کر دیا ہے۔ اب ہمیں اپنی اپنی نجات کی فکر ہے۔

مذہبی پیشوائیت چاہتی کیا ہے؟

مذہب کی اوّلیں کوشش یہ ہوتی ہے کہ مملکت کا پورا اختیار بالواسطہ مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہے حکمران طبقہ ان کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی مشینری کا کام دے۔ اس انداز کو تھیاکریسی کہتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا ممکن نہ ہو تو مذہبی پیشوائیت یہ چاہتی ہے کہ مملکت میں ایسا نظام قائم ہو جس میں امورِ سیاست حکومت کی تفویض میں رہیں اور امورِ مذہب، مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں۔ اسے سیکولر اندازِ حکومت کہا جاتا ہے۔ ہمارے قرونِ اوّل کے بعد جب دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا، تو اس میں ایسے ادوار بھی آتے رہے جن میں تھیاکریسی کا دَور دَورہ تھا لیکن بہ ہیئتِ مجموعی حکومتوں کا انداز سیکولر رہا۔ اسی انداز کو انگریزوں نے ہندوستان میں قائم رکھا۔ ان کے عہدِ حکومت میں بھی پبلک لاز حکومت کی تحویل میں تھے اور پرسنل لاز اربابِ مذہب کے سپرد۔ تحریکِ پاکستان سے مقصود یہ تھا کہ یہاں نہ تھیاکریسی بار پا سکے نہ سیکولرازم یہاں دین کی حکمرانی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس میں (ملوکیت اور سرمایہ داری کی طرح) مذہبی پیشوائیت کی بھی کوئی گنجائش نہیں رہتی تھی۔ یہ انداز مذہبی پیشوائیت کو (SUIT) نہیں کرتا تھا، اس لئے پاکستان کے مطالبہ کی اس نے سخت مخالفت کی۔ پاکستان بننے کے بعد مذہب کی چیرہ دستیاں اور تیز ہو گئیں۔

پاکستان میں مذہب کی چیرہ دستیاں

ان مذہبی عناصر، جنہوں نے پاکستان کی شدت سے مخالفت کی تھی، کی اب کوشش یہ ہے کہ پاکستان میں دینِ اسلام بہ حیثیت مذہب ہی کے زندہ رہے، دین کے نظام کی شکل اختیار نہ کرے۔ اس کوشش میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ ذرا سوچئے کہ مسلمانوں کو ایک ایسی مملکت مل جانے کے بعد بھی، جسے انہوں نے دین کے نظام قائم کرنے کے لئے حاصل کیا تھا، یہاں وہ نظام قائم نہ ہو، مذہب ہی باقی و قائم رہے (جیسا کہ ہندوستان میں تھا)، اسلام اور اور پاکستان کے خلاف سازش نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ ستم تو یہ ہے کہ یہ سب کچھ ہماری

ل کے سامنے ہو رہا ہے اور ہم خاموش ہیں۔ یہاں اب اسلامی شریعت کے احیاء کے نام سے مُلّا کی شریعت
ی جا رہی ہے۔ اسلام کے نام پر حاصل کئے جانے والے ملکِ عزیز میں، اب یہاں اسلام ہی کے نام پر مذہبی
ل کا دور دورہ ہے۔ ہر مذہبی فرقہ کی اپنی اپنی سمت ہے، اپنا اپنا "اسلام" ہے، ہر فرقہ "قرآن وسنّت" کی
طلاح کی تعبیر، شخصی قوانین کی حد تک، اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق کر سکتا ہے۔ غور کیجئے! اسلامی جمہوریہ اور
ں فرقہ سازی کی اجازت! یا للعجب۔ اس کے باوجود ہمارا دعوٰے ہے کہ ہم مسلمان ہیں، "اہلِ ایمان" ہیں۔
س علامہ اقبالؒ:

یہ مسلمان ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

م بات تو اسلام کی کرتے ہیں، عملاً نافذ مذہب کرتے ہیں، فرقہ واریت کو ختم کرنے کی باتیں کرتے ہیں جسے ہم نے
نے موجودہ آئین میں تحفظ فراہم کر رکھا ہے۔ ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہم جو کچھ زبان سے کہتے ہیں اس پر ہمیں دل سے
ین نہیں اور جو کچھ ہمارے دل میں ہے اُسے زبان پر لانے کی جرأت نہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ اس وقت ہماری قوم
پنے ظاہر و باطن میں بے حد تضاد کی زندگی بسر کر رہی ہے، اس سے اس کے تشخص میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ اس
تشار نے منافقت یا نفسا نفسی یا خود غرضی کو جنم دیا ہے۔ خود غرضی کا مرض اس وقت ہمارے معاشرے میں وبا کی
رح پھیلا ہوا ہے۔ اب تو حالت یہ ہے:

مبتلا سب ہوں جو بیماریٔ خود غرضی میں
کون پہچانے مرض، کس سے دوا لی جائے
کیا کروں بات صداقت کی نکل جاتی ہے
لاکھ چاہوں بھی کہ مُنہ سے نہ نکالی جائے (صائم کرنالی)

تشار کی بڑی وجہ تو یہی ہے کہ ہمارا اپنے ان نظریاتِ حیات اور تصوراتِ زندگی پر سے یقین اُٹھ گیا ہے، جن پر
ۂ پاکستان اور تحریکِ پاکستان کی بنیادیں اٹھتی ہیں۔ جس معاشرے کے افراد اس طرح بے یقینی کے جذام میں
ہو جائیں ان سے صحت مندانہ اقدام کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے۔ نوجوان نسل نہ صرف نظریۂ پاکستان سے
ہوتی جا رہی ہے بلکہ اکثر نے سرکشی اور فساد انگیزی کی تخریبی روش اختیار کر لی ہے۔ اس صورت حال کے بڑی حد
ذمہ دار وہ مذہبی عناصر ہیں جو اپنے مخصوص مذہبی مقاصد کے لئے طلباء کو سیاسی ہنگاموں میں ملوّث کرتے ہیں۔

ان نسل کی تعلیم و تربیت

پاکستان بننے کے بعد سب سے مقدم کرنے کا کام یہ تھا کہ اپنی نوجوان نسل کی تعلیم و تربیت اس آئیڈیالوجی

(نظریہ) کے مطابق کرتے جس کے تحفظ کے لئے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا ہم نے اس مقدس فریضہ سے مجرمانہ تغافل برتا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم آج اپنی قوم کی بے راہ روی کا اس قدر ماتم کر رہے ہیں۔ ؎

ہر سینے میں اک صبح قیامت ہے نمودار
افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا! (اقبالؒ)

ہم یہی بھول گئے کہ پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے، اس کی بنیاد اللہ کے دین، اسلام پر قائم ہے، وطن یا نسل کو بنائے قومیت قرار دینے سے، قوم کی تشکیل کے لئے کسی قسم کی جدوجہد کی ضرورت نہیں ہوتی، ہر بچہ پیدائشی طور پر اُس قوم کا فرد ہوتا ہے۔ لیکن کسی نظریہ کی بنا پر قوم کی تشکیل کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ قوم کے بچوں کو اس نظریہ کی تعلیم دی جائے۔ یہی ہم نے نہیں کیا۔ نظریہ پاکستان جو درحقیقت قرآن ہی کے نظریہ حیات کا دوسرا نام ہے، کو بچوں کی تعلیم و تربیت کا مرکز اور محور نہیں بنایا۔

اس حقیقت سے کوئی باشعور شخص انکار نہیں کر سکتا کہ نوجوان طبقہ، خصوصاً تعلیم یافتہ نوجوان طبقے کی اہمیت کسی معاشرے میں وہی ہے جو انسانی جسم میں صالح خون کی ہے۔ یہ خون اگر موجود رہے اور اپنا کردار ادا کرتا رہے تو انسانی جسم تندرست و توانا رہتا اور نشو و نما پاتا ہے ورنہ موت اس کا مقدر ہے۔

ہمارے نزدیک طلباء اور سیاست کا وہ تعلق جو اس وقت تعلیمی اداروں میں عملاً موجود ہے دینی اور ملی مصالح کے لئے زہر قاتل ہے۔ وہ جگہیں جہاں سے معاشرے کو تعلیم و تربیت کی غذا ملنی چاہیئے اس رجحان کے نتیجے میں جرائم کے اڈے بن گئے ہیں، جہاں علم ارزاں ہونا چاہیئے وہاں خون کی ارزانی ہے۔ آئے دن فائرنگ اور غنڈہ گردی کی وارداتیں ان اداروں کا معمول ہیں۔ جس طرح انسانی جسم میں خون کے فاسد ہو جانے کا نتیجہ سوائے موت کے کچھ نہیں، اسی طرح ہمارے ہاں طلباء کی موجودہ روش کا نتیجہ اس عظیم قومی و ملی زوال کے سوا کچھ نہیں جس سے ہم دوچار ہیں۔

اس تباہی سے بچنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ ہم قوم کے نوجوانوں کی تعلیم کا صحیح انتظام کریں۔ پاکستان کی آئیڈیالوجی، قرآن حکیم کی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کے قرآنی تصور کے سوا اور کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے نوجوانوں کی صحیح تعلیم کا مقصود بھی اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے قلب و دماغ کو اسی سانچے میں ڈھالا جائے اور ان میں ایسی صلاحیت پیدا کر دی جائے کہ دنیا کا کوئی معاملہ سامنے آئے وہ فیصلہ کر سکیں کہ اس باب میں قرآن ہمیں کیا راہ نمائی دیتا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ،

از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد

اسلامی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے بعد طالب علم اس قابل ہو جائے کہ "دنیا کا ہر دروازہ دین کی

...سے کھول سکے۔" درس نظامی کی درس گاہیں یہ دروازہ کھولتی نہیں، بند کرتی ہیں۔ ے

ممکن نہیں تخلیقِ خودی خانقہوں سے
اس شعلۂ نم خوردہ سے ٹوٹے گا شرر کیا!

...فرمایا آپ نے کہ جب قوم کی نگاہوں سے قرآن کا متعین کردہ فریضۂ حیات اوجھل ہو جائے تو قوم مذہب کی ...دائرہ آتی ہے اور پھر مذہبی پیشوائیت "اسلاف کے مسلک" کے نام پر اپنی من مانی کرتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد قوم میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یہی حال اب ہمارا ہے اب تو ایسا ...ہے کہ جیسے غور و فکر ہم نے اپنے اوپر حرام کر رکھا ہو۔ بھلا سوچیئے کہ اسلام کے نام پر حاصل کئے جانیوالے ...ملک میں، اسلام ہی کے نام پر، مذہبی فرقوں کو آئینی اور قانونی تحفظ فراہم کرنا، فرقہ پرستی کے بارے میں قرآن کے ...واضح احکام کی دھجیاں بکھیرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہاں، پاکستان میں، آخری اقتدار ...مذہبی پیشوائیت کے ہاتھوں میں آگیا ہے۔ پاکستان کا مقصد تو کیا تھا اور ہو کیا رہا ہے۔ اب بھی یہاں درحقیقت ...سیکولرازم رائج ہے۔ لیکن ہم کھلے بندوں اس کا نام لینے سے جھجکتے اور جھینپتے ہیں۔ اقبالؒ پکار اٹھتا ہے کہ ے

مجھ کو تو یہ دُنیا نظر آتی ہے دگرگوں
معلوم نہیں دیکھتی ہے تیری نظر کیا

..."دگرگوں" کی جو کیفیت اس وقت ملک میں پھیلی ہوئی ہے اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ پاکستان کی بنیادیں دین پر اٹھنی ...چاہیئے تھیں۔ لیکن یہاں اب مذہب کا دور دورہ ہے۔ بقول شاعر ے

اپنی بربادیاں اپنے ہاتھوں ہوئیں
جاگنا تھا ہمیں، مگر سو گئے
گیسوئے وقت اب کون سلجھائے گا
بے خبر جاگ اٹھے، باخبر سو گئے

...دیکھیں کہ جب قوم مذہب کے گرداب میں اس بُری طرح پھنس جائے جس طرح آج ہم ہیں تو قرآنِ حکیم اس عذاب ...سے نکلنے کے لئے کیا علاج تجویز کرتا ہے۔

...قرآنی علاج

قرآنِ حکیم کی رُو سے زندگی کا آگے بڑھتے چلے جانا اس کی کامیابی ہے اور اس کا کسی مقام پر رُک جانا اس ...کی ناکامی اور نامراد زندگی کا کسی مقام پر رُک جانے کو قرآن نے "عذاب" سے تعبیر کیا ہے۔ اس "عذاب"

کی مختلف شکلیں ہیں۔ ذلت و پستی، محکومی و محتاجی، ضعف و ناطاقتی، بے حمیتی و بے غیرتی، بے کسی و بے بس
غربت و افلاس، سب اس رُک جانے کے فطری نتائج ہیں۔ ہماری قوم صدیوں سے ایک ہی مقام پر رُکی کھڑ
ہے اور ان سب "عذاب" میں گرفتار ہے۔ لیکن ہم ذرا نہیں سوچتے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ زندگی ایسی ہی ہوتی ہے
زندگی کا حرکیاتی تصور ہماری نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہے۔

اس "عذاب" سے نکلنے کے لئے قرآنِ حکیم نے ایک قانون دیا ہے جسے پڑھا تو اکثر جاتا ہے لیکن جس پر غ
بہت کم کیا جاتا ہے۔ وہ ہے:۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ؕ (۱۳/۱۱)

"یاد رکھو! کہ جس طرح یہ محکم اصول ہے کہ زندگی کی جو خوشگواریاں کسی قوم کو حاصل ہوں
وہ اس سے نہیں چھنتیں جب تک وہ ان کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے (۸/۵۳)۔
اسی طرح یہ بھی ایک اٹل اور غیر متبدل قانون ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا
جب تک وہ قوم خود اپنی نفسات کو نہ بدلے۔"

ان آیات (۸/۵۳ اور ۱۳/۱۱) میں قرآنِ حکیم نے ایک ایسا بنیادی اصول فرمایا ہے جس پر انفرادی اور اجتماعی زندگی
کا دارومدار ہے ــــ جس قسم کا زاویۂ نگاہ، اسی قسم کی زندگی۔

جب ہم کہتے ہیں کہ قرنِ اوّل کی جماعتِ مومنین کے شرف و عظمت کا راز تمسک بالقرآن میں تھا (۴۳/۴۴)
تو اس سے یہی مطلب ہے کہ قرآنِ حکیم کے احکام و ضوابط کی غرض و غایت اُن کے دل کی گہرائیوں میں اسی طرح اُتر
گئی کہ اُن کی دنیا بدل گئی۔ زندگی کے بارے میں ان کا زاویۂ نگاہ بدل گیا۔ جب زاویۂ نگاہ بدل گیا تو اشیائے
کائنات کی قدر و قیمت بدل گئی۔ اسی کا نام تغیرِ نفس ہے، تو قرآنی اصول یہ ٹھہرا کہ تغیرِ نفس کے بغیر تغیرِ احوال
ممکن نہیں۔

اب آیئے اپنی حالت پر ایک نگاہ ڈالیں۔ ہمارے پاس بھی اللہ کی وہی زندہ اور پائندہ کتاب ــــ القرآن
ہے جس میں اللہ کا وہ اسلام، جس نے قرنِ اوّل کے مسلمانوں کو سرفرازیاں عطا کی تھیں، محفوظ ہے۔ پھر کیا
بات ہے کہ ہمارے موجودہ اسلام سے وہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے جو اسلام سے ہونے چاہیئے تھے۔ ہمارا شمار
دنیا کی پست ترین قوموں میں ہوتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے کہ ہم نے قرآنِ حکیم
کو مہجور بنا کر رکھ دیا ہے۔ قرآنِ حکیم کے اس واشگاف اعلان کو ہم جھوم جھوم کر پڑھتے تو ہیں لیکن اس پر غور و
فکر کی زحمت نہیں کرتے:۔

وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ

مَهْجُوْرًا ○ (۲۵/۳۰)

"اور رسولؐ کہے گا کہ اے میرے رب! یہی ہے میری وہ قوم جس نے اس قرآن کو اپنے خود ساختہ معتقدات کی رسیوں سے اس طرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم چلنے کے قابل بھی نہیں رہا تھا"

جس دن ہمیں یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ رسول اللہ قیامت کے دن ہماری شفاعت نہیں "شکایت" کریں گے، اسی دن سے ہماری نفسیات میں وہ تغیر آجائے گا جس کا قرآنِ حکیم تقاضا کرتا ہے۔ اسی دن سے ہماری دنیا بھی بدلنی شروع ہو جائے گی، ہمارا زاویۂ نگاہ بدل جائے گا، ہماری "خودی" مسلمان ہو جائے گی۔ یعنی قرآن کی صداقتوں اور حقائق پر ایمان ہمارے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے گا۔ پھر ہمیں قرآن کی یہ بات بھی سمجھ میں آجائے گی کہ جب قوم مذہب کی سطح پر اتر آتی ہے تو پھر دین کی طرف لوٹنے کا طریقہ کیا ہے۔

جو قوم دین کو مذہب سے بدل دیتی ہے، لیکن اپنے آپ کو منسوب اسی دین کی طرف کرتی رہتی ہے، قرآنِ حکیم انہیں من حیث القوم مسلمان قرار دیتا ہے۔ یعنی اُمتِ محمدیہ کے افراد ـــ اور ان کا غیر مسلموں سے جداگانہ اور الگ تشخص تسلیم کرتا ہے۔ اس نہج سے انہیں "یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ لیکن چونکہ انہوں نے اللہ کے مقرر کردہ مقصدِ حیات، یعنی دینِ خداوندی کو نظام ہائے عالم پر غالب کرنا، فراموش کر دیا ہوتا ہے اس لئے اُن سے کہتا ہے کہ اسی مقصد کو از سرِ نو اپنے سامنے رکھ لو۔ وہ کہتا ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ الْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ ...... (۴/۱۳۶)

اس آیت کا عام ترجمہ یہ ہے: "اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور اس کی کتاب پر جسے اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کیا"

(ضمناً) یہاں یہ بات بظاہر عجیب سی لگے گی کہ جن لوگوں کو اللہ خود "اے ایمان والو" کہہ کر مخاطب کرتا ہے انہیں ایمان لانے کے لئے کیوں کہا جا رہا ہے۔ یہ بڑی عظیم حقیقت ہے اور گہرے غور و فکر کی متقاضی۔ یہاں ایک اہم اور بنیادی حقیقت سامنے لائی جا رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس نظام کے حامل وہ افراد نہیں ہوں گے جو محض مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے سمجھ لیں کہ وہ جماعتِ مومنین کے ممبر ہیں۔ یہ جماعت آئیڈیالوجی (ایمان) کی بنیادوں پر متشکل ہوتی ہے اور وہی شخص اس کا ممبر ہو سکتا ہے اور رہ سکتا ہے جو اس آئیڈیالوجی کی صداقت پر یقین رکھے۔ مسلمانوں کے گھر پیدا ہونے والوں کے متعلق اصولاً تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ ان امور پر ایمان رکھتے ہیں جو اس آیت میں بیان ہوئے ہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ علیٰ وجہ البصیرت بھی اس نظام کے بنیادی اصولوں پر یقین رکھیں۔

اب آیئے اصل موضوع کی طرف۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ مذہب کو پھر سے دین میں تبدیل کرنے کے لئے قرآنی طریقہ یہ ہے کہ اپنے فریضۂ حیات' یعنی دین کو دیگر نظاموں پر غالب کرنا' کو دوبارہ اپنے سامنے رکھ لو۔ ظاہر ہے کہ ایسا اسلامی مملکت کے ذریعے ممکن ہوگا جسے امت متشکل کرے گی۔ اس کے قیام کے لئے ایک ایسے "میرِ کارواں" کی ضرورت ہے جو دین کے رنگ میں رنگا ہوا اور جو ملت کے کارواں کو اس کی صحیح منزل کی طرف لے جانے کا عزم رکھتا ہو۔ ہماری منزل خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کا سلسلہ دوبارہ قائم کرنا ہے تاکہ ملت پھر اسی طرح احکام و قوانینِ خداوندی کے ماتحت زندگی بسر کرے جس طرح عہدِ رسولؐ اللہ اور دورِ خلافتِ راشدہؓ میں کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو قائم کرنے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانینِ خداوندی کے تابع ہوگی۔

یاد رہے کہ ایک اجتماعی معاشرہ یا قرآنی نظام یا طیب جماعت اسی صورت میں متشکل ہو سکتی ہے جب افرادِ معاشرہ بھی صالح ہوں۔ یہ نکتہ بڑا بنیادی ہے جس کی رو سے دائرہ یوں قائم ہوتا ہے کہ افراد صالح ہوں تو جماعت یا نظام صالح ہوتا ہے اور اجتماعی نظام صالح ہو تو افراد بھی صالح ہوتے ہیں۔ ملت کے ایک فرد کی حیثیت سے ہمیں اپنی ذمہ داریاں پہچاننی چاہئیں۔ ہماری سب سے بڑی ذمہ داری تو یہی ہے کہ ایسا مسلمان بنیں جو اپنے دعوئ ایمان کا ثبوت اپنے عمل سے پیش کر سکے۔ جو کچھ زبان سے کہے اسے عمل سے پورا کر کے دکھا دے (۳-۲/۶۱)۔ بالفاظِ دیگر اصطلاحی مسلمان نہیں، قرآنی مسلمان بن کر دکھا دیں کہ ہم واقعی "اہلِ ایمان" ہیں اور قرآنِ حکیم کے ایک ایک لفظ پر یقین رکھتے ہیں۔ اپنے دل سے پوچھئے کہ آپ کیا ہیں؟ ؎

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم (اقبالؒ)

اور پوچھتے رہیئے۔ ممکن ہے اس طرح ہمارے اندر وہ تغیرِ نفس پیدا ہو جائے جس کے بغیر ہمارے موجودہ حالات میں تغیر ممکن نہیں۔

اندازِ بیاں گرچہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اُتر جائے ترے دل میں مری بات

والسلام

(اعزاز الدین احمد خاں)

ملک حنیف وجدانی

اکیسویں صدی کے
تقاضے اور قرآن

(نظریہ ــــــ قانون سازی اور قوتِ نافذہ)

قسط دوم

۳۔ قرآنک ورلڈ آرڈر

؎ معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

نوعِ انسانی میں عالمگیر انسانی شعور کا بہرہ وافر رکھنے والی مقتدر روحانی پیشوا اور معزز ترین شخصیت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہے۔ آنجناب نے دستِ مبارک سے بیت اللہ شریف کی بنیاد رکھی۔

موجودہ زمانے میں "لارڈ برٹرینڈ رسل" نے "عالمی شہریت" کا نظریہ پیش کیا تو لوگ اسے نابغۂ روزگار کہنے لگے۔ پھر سابق "امریکی صدر جارج بش" نے "نیو ورلڈ آرڈر" کا تصور پیش کر کے خاصی شہرت حاصل کی۔ "عالمی شہریت" کا نظریہ ہو یا "نیو ورلڈ آرڈر" کا تصور، دونوں تخیلات کی دنیا کے اسیر ہیں۔ ان کا کوئی عالمی مرکز یا ضابطہ قوانین موجود نہیں ہے۔

ہم مسلمان جو اپنے اسلاف کے نظریات اور کارناموں کو فراموش کر چکے ہیں۔ دوسرے دیدہ وروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے ہاں "قرآنک ورلڈ آرڈر" کا غیر متبدل قانونی معیار، ضابطۂ اخلاق، مستقل اقدار اور عالمی مرکز مکۂ شریف موجود ہے۔ اگر مسلم مدبرین کا ایک اجتماع ہی "قرآنک ورلڈ آرڈر" پر کام کرے، تو یہ کارنامہ اقوامِ عالم کی بصیرت میں اضافہ کرنے کے لئے کافی ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ آیئے اس کا ذرا تفصیلی جائزہ لیں۔

قانون اور عالمی مرکز ہر ملک، سٹیٹ یا ریاست کا ایک مرکزی مقام ہوتا ہے جہاں اسے قانونی تحفظ حاصل ہوتا

ہے۔ لوگ مرکز میں موجود با اختیار شخصیات سے رجوع کرتے ہیں۔ جن کو عدالتی، مالیاتی اور انتظامی اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کو علامہ اقبالؒ یوں پیش کرتے ہیں۔

بگذر از بے مرکزی پایندہ شو (یا جمعیت آدم کا تصور)

عالمی سطح پر ایسا مرکز اشد ضروری ہے۔ لیکن اس کا دیرپا تصوراتی معیار کسی کے پاس نہیں۔ دنیا میں صرف "امتِ مسلمہ" کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کا عالمی مرکز موجود ہے۔ حج بیت اللہ شریف پر ہر سال مسلمانوں کی کثیر تعداد وہاں پہنچ جاتی ہے۔ لیکن مرکز کے پاس اختیارات و ذرائع نہیں ہیں جن سے وہ ساری "امتِ مسلمہ" کی شیرازہ بندی یا صف بندی کر کے اپنا نقش دوام ثبت کر سکے۔

"قرآنک ورلڈ آرڈر" کے سلسلے میں "مرکز" کو اختیارات تفویض کرنا بھی شامل ہے۔ جہاں حج بیت اللہ کے موقع پر لاکھوں مسلمان ایک امام کے پیچھے بیک وقت رکوع و سجود کرتے ہیں وہاں انہیں یہ امتیاز بھی حاصل ہونا چاہیئے کہ مرکز کے احکام کی تعمیل و اطاعت گزاری کا روزِ سعید بھی دیکھ سکیں۔ اس کے بغیر مرکز کا احترام بطور مقام ضرور ہے لیکن بطور "امام مرکز" ناپید ہے۔ "قرآنک ورلڈ آرڈر" کی یہی گم گشتہ کڑی ہماری تقدیر کے لئے زنجیرِ پا اور تعمیر خودی کے لئے انتہائی محرومی کا وسیلہ ہے۔ اسی تصور کے مطابق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا۔

معمارِ حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز

اور دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

آج دنیائے اسلام کو اس دانائے راز کی ضرورت ہے۔ جو "قرآنک ورلڈ آرڈر" کو نہ صرف متعارف کرائے بلکہ اس کی آواز دنیا کی ہر زبان کے ذریعہ اقوامِ عالم تک پہنچائے تاکہ بیت اللہ شریف اور قرآن مجید کی عالمی اہمیت واضح ہو سکے۔ اگر کوئی ملک یا ادارہ ہی یہ تصور عام کرنا شروع کر دے تو شاید ہماری منزل قریب آجائے۔

قانون سازی

دنیائے اسلام ایک بحرِ بیکراں کی مانند ہے۔ اس کو صرف قرآنک ورلڈ آرڈر کے ذریعہ ہی یکجا کیا جا سکتا ہے اور ایسی قانون سازی کی جا سکتی ہے کہ ہم قانون سازی کے انداز میں "قرآنک ورلڈ آرڈر" کو تحفظ فراہم کریں۔

۱۔ مُسلم اُخوّۃ۔ کونسلر، چیئرمین، ایم پی اے، ایم این اے، سپیکر، گورنر، وزیر اعلیٰ و وزراء، وزیر اعظم و وزراء، سینیٹرز، چیئرمین سینٹ اور محترم صدر مملکت تک کے ہر "حلف نامہ" میں یہ الفاظ شامل کئے جائیں۔

"عالمی سطح پر "مسلم اخوۃ" کے لئے کام کروں گا اور اس سلسلہ میں وقتی، مالی اور جانی قربانی سے دریغ نہیں کروں گا۔"

۲۔ آئینِ پاکستان میں یہ الفاظ شامل کئے جائیں۔

"پاکستان کے سرکاری حج وفد کی قیادت ایک اعلیٰ ترین ذمہ دار شخصیت (اسپیکر، وزیراعظم، چیئرمین سینٹ) کیا کرے گی۔"

۳۔ نصابِ تعلیم میں "مسلم اخوت" پر مبنی نظم و نثر کا جاندار مواد شامل کیا جائے۔

۴۔ فرقہ بندی پر مبنی لٹریچر کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

۵۔ مسلم اخوت کے لئے کام کرنے والوں کو "سید جمال الدین افغانی" ایوارڈ ہر سال دیا جائے۔

۶۔ "لاء کالج" کے نصاب میں "مسلم اخوت" کو شامل کیا جائے۔

لب پہ دُعا ہے اے اللہ

(عروج قاسم)

کیسے بنائیں پاکستان کو ہم خوشحال؟
ہر بچے کے لب پر ہے یہی ایک سوال
کب مٹیں گی یہ بُرائیاں
کب ختم ہوں گی مہنگائیاں؟
کب ختم ہو گی رشوت؟
کب ہو گی لوگوں کی عزت؟

کب بنیں گی خالص دوائیاں؟
کب ختم ہوں گی آپس کی لڑائیاں؟
کب بنے گا ایسا پاکستان؟
جس میں نافذ ہو قرآن
ہر دم لب پر ہے یہی دُعا
بدل دے ہم کو، اے اللہ

باسمہ تعالیٰ

تعلیم و تربیت

بزم طلوعِ اسلام کویت نے اپنے ہاں تربیتی اسباق کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے۔ جسے ہم قارئین کے استفادہ کے لئے شاملِ اشاعت کر رہے ہیں۔ دوسری بزمیں اپنے ہاں اس قسم کا سلسلہ شروع کر سکیں تو ہمیں خوشی ہوگی ——— (ناظمِ ادارہ)

تلاوت کلام پاک

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ ؕ

تعارف

بشیر احمد عابد

السلام علیکم! حاضرینِ گرامی اس تربیتی نشست کا مقصد ہماری صلاحیتوں کی نشوونما ہے۔ قرآنِ کریم کی رُو سے ہم پر جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ہمیں اُن کو بہتر طور پر سرانجام دے سکیں۔ قرآنِ کریم کی تعلیمات کو عملی نظام میں ڈھالنے کے لئے جو وسعتِ قلب و نگاہ درکار ہوتی ہے وہ ہم میں پیدا ہو جائے۔ یہ پروگرام انہی مقاصد کے حصول کے لئے ترتیب دیا گیا ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے ہیں کہ باری تعالیٰ ہماری اس کاوش کو اپنی رحمت سے نوازے اور اس پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لئے ہمارے راستے روشن کرے۔ آمین

پروگرام کے مطابق ہر ماہ ایک نشست ہوا کرے گی۔ ہر نشست کے چار پیریڈ ہوں گے اور ہر پیریڈ کم از کم ۳۰ منٹ کا ہوگا۔ درج ذیل موضوعات پر تربیتی لیکچرز دیئے جائیں گے۔

۱۔ **تغیرِ نفس!** نفس کیا ہوتا ہے، اس پر کون سے عوامل اثر انداز ہوتے ہیں، نفس کی تبدیلی کا معاشرہ پر کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ سب گفتگو قرآنِ کریم کی تعلیمات اور علومِ حاضرہ کی روشنی میں ہوگی۔

۲۔ احادیث و تاریخ | مقامِ احادیث کیا ہے، کون سی احادیث قرآنِ کریم کی تعلیمات کے متضاد ہیں۔ احادیث و تاریخی واقعات کا باہمی تعلق، احادیث و تاریخ اور قرآنِ کریم کا تقابلی جائزہ۔

۳۔ حالاتِ حاضرہ اور قرآنی تعلیمات | سیاسی، سماجی، معاشی طور پر اقوامِ عالم جن مسائل سے دوچار ہیں، ان کا قرآنِ کریم کی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ۔

احباب کی آراء پر مشتمل تجاویز کا جائزہ لیا جائے گا۔ آج کی نشست میں تو شاید اتنا وقت نہ مل سکے کہ ہم ان تمام موضوعات کو ان کی وسعت کے تقاضوں کے مطابق لے سکیں، تاہم کوشش کریں گے کہ تھوڑی تھوڑی سہی لیکن چاروں حصوں پر گفتگو ہو جائے۔

تو آیئے، سب سے پہلے ہم عبید الرحمان صاحب کو سنتے ہیں۔ آپ ہمیں بتائیں گے کہ قرآنی انقلاب کے لئے تغیرِ نفس کس قدر ضروری ہے۔

تغیرِ نفس

عبید الرحمٰن ارائیں

السلام علیکم! یہ جو موضوع ہے تغیرِ نفس کا! اس پر کچھ کہنے سے قبل یہ گزارش کروں گا کہ ہم اتنے بڑے عالم نہیں کہ جو کچھ کہیں وہ کسی موضوع پر حتمی رائے بن جائے۔ میں کہوں یا طلوعِ اسلام کے پلیٹ فارم سے کوئی بھی کہے اس سے اختلاف کا ہر ایک کو حق حاصل ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ بزم میں درس سننے طرح طرح کے لوگ آتے ہیں۔ بعض کا مقصد صرف وقت گزاری ہوتا ہے۔ جبکہ کچھ واقعی سنجیدگی سے کچھ سیکھنے آتے ہیں، وہ حقیقی تبدیلی چاہتے ہیں۔ اپنی ذات میں اور اپنے ماحول میں بھی ہمارے پیشِ نظر ایسے ہی افراد ہونے چاہئیں۔ آپ اتفاق کرینگے کہ اب یہ چیز کھل کر سامنے آنی چاہیئے کہ یہ پروگرام، یہ درس، یہ لٹریچر، یہ ساری سعی و کاوش کا مطلوب مقصود کیا ہے؟ اگر آپ اس دنیا پر ایک نگاہ ڈالیں تو آپ کو نظر آئیگا کہ بنیادی طور پر ساری نوعِ انسان دو گروہوں میں بٹی ہے۔ ایک گروہ وہ ہے جو صرف اپنا مفاد چاہتا ہے اور دوسرا وہ جو کہ سب کا مفاد چاہتا ہے۔ اس گروہ کا ایمان ہے۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً ؕ اس لئے میرا فائدہ اسی میں ہے جس میں سب کا فائدہ ہے۔ ہماری مثال ایک جسم کی سی ہے۔ جس کی ہر اکائی اپنے وجود کے مفاد کے لئے کسی دوسری اکائی کی محتاج اور رہینِ منت ہے۔ وہ فائدہ کیا جس میں کسی دوسرے کا فائدہ نہ ہو۔ ایسے لوگوں کو جو سب کا فائدہ چاہتے ہیں۔ قرآنِ کریم کہتا ہے۔ یہ لوگ خواہ کسی قوم، وطن، نسل یا رنگ کے حامل کیوں نہ ہوں۔ بنیادی طور پر یہ ایک گروہ کے فرد ہیں۔

ان کے برعکس، دوسرا گروہ مفاد پرست طبقے کا ہے۔ انہیں اپنی ذاتی منفعت کے علاوہ کوئی چیز اچھی نہیں لگتی ۔ بحیثیت قرآنی طالب علم ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ لوگوں کو اس گروہ سے نکال کر دوسرے گروہ میں جن کے سامنے پوری انسانی برادری کا مفاد ہوتا ہے لے جانا چاہیئے، انہیں سمجھانا چاہیئے۔ ذاتی مفاد والی روش زیادہ کامیاب روش نہیں۔ اس ڈگر پر انسان زیادہ فاصلہ نہیں طے کر سکتا۔ ہم سب چونکہ ایک برادری کے افراد ہیں اور اپنی ضرورتوں کے لئے ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ لہٰذا جب تک ہم مل جل کر ایک دوسرے کے مفاد کا تحفظ نہیں کریں گے۔ مثال کے طور پر میں یہاں کار چلا کر پہنچا۔ گھر سے لے کر یہاں تک پہنچنے میں بظاہر تو یوں نظر آتا ہے کہ سب میری اپنی کوشش کی وجہ سے ہوا۔ لیکن گہری نظر سے دیکھا جائے تو مجھے اس سفر میں مدد دینے کے لئے ہزاروں افراد کی کوشش شامل ہے۔ یعنی وہ لوگ کہ جنہوں نے یہ کار تیار کی، وہ لوگ جنہوں نے کار کی تیاری میں سامان فراہم کیا، وہ لوگ جنہوں نے سڑکیں بنائیں وغیرہ گھر سے یہاں تک بحفاظت اور آرام دہ طور پر پہنچنے کے لئے ان سب افراد نے میری مدد کی۔ اب اگر میں ان سب افراد کو نظر انداز کر کے صرف اپنے مفاد کو سوچوں، تو بنیادی طور پر میرا نظریہ غلط ہوگا۔ اگر یہ سب لوگ مل کر میری مدد نہ کرتے تو میں زیادہ دُور تک یہ سفر نہ کر سکتا۔ آجکل کے دور میں آپ اکیلے روٹی کے بھی محتاج ہیں۔ لہٰذا یہ قطعی غیر فطری ہوگا۔ اگر کوئی صرف اپنے مفاد کا ہی سوچے۔ اس لئے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد کہ تم لوگ اپنے انفرادی مفادات پر اجتماعی مفادات کو ترجیح دیا کرو۔ اپنے ذاتی مفادات کو ترک کر کے ایسی روش اپناؤ جس میں سب کا بھلا ہو۔ یعنی یوں قرآنِ کریم ہمیں ایک گروپ سے نکال کر دوسرے گروپ میں لے جانا چاہتا ہے، اِسے تغیرِ نفس کہتے ہیں۔ یعنی انسان اپنے ذاتی مفادات سے بلند ہو کر یا اس محدود دائرے سے نکل کر پوری نوعِ انسان کے مفادات کا محافظ بن جائے۔ اس تغیرِ نفس کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ قرآنِ کریم کا یہ بنیادی اور نہایت اہم اُصول ہے۔

جب تک ہم اپنے ذاتی مفادات سے بلند ہو کر تمام انسانوں کے مفادات کی بات نہیں کریں گے۔ تب تک نہ تو ہماری اپنی اصلاح ممکن ہے اور نہ ہی معاشرے میں کسی قسم کی ترقی ہوگی۔ صحیح تبدیلی یہی تبدیلی ہے۔ باقی سب ریاکاری ہے۔ صحیح منشاء خداوندی یہی ہے۔ جب تک آپ کو نفس کی حقیقت کا علم نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے آپ اس میں تبدیلی کا کیسے سوچیں گے؟ تغیرِ نفس کے لئے نفس کا جاننا ازحد ضروری ہے۔ نفس کو سمجھنے کے بعد اور اس میں تبدیلی پیدا کرنے کے طریقۂ کار اور ان عوامل کا سمجھنا ضروری جو اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ لیکن ان موضوعات کی طرف ہم آئندہ لیکچرز میں توجہ دیں گے۔ فی الوقت ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ نفس کسے کہتے ہیں۔ تغیرِ نفس اصولی طور پر وحی کے تابع زندگی بسر کرنے سے ہوتا ہے۔ اس لئے نفس کو ہم وحی کی تعلیمات کی رُو سے سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ اسلام میں نفس کا مترادف روح کو سمجھا گیا ہے۔ جب کہ فی الحقیقت ایسی بات نہیں، روح اور روحانیت کے متعلق

جتنے تصورات ہیں، یہ سب قرآنِ کریم سے باہر کے تصورات ہیں۔ عربی لغت کی رو سے روح کے معنی توانائی کے ہیں۔ یہ وہ توانائی ہے جو اللہ تعالیٰ نے خصوصی طور پر جسمِ انسانی کو عطا کی۔ خدا نے جب اس کرۂ ارض پر زندگی کو بسانے کا پروگرام بنایا تو اس کے لئے تدریجی ارتقاء کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نسبت سے خدا کی صفت ذی المعارج کی ہے یعنی وہ ہستی جو استبائے کائنات کو بتدریج نقطۂ آغاز سے لے کر ان کے انجام تک پہنچاتا ہے۔ انسانی زندگی کی بھی کیفیت یہ ہے جب زندگی اپنے ارتقائی مراحل طے کرتی ہوئی پیکرِ انسانی میں پہنچی، تو قرآن کہتا ہے، اللہ تعالےٰ نے اس پیکر میں اپنی روح پھونک دی۔

"وَنَفَخْنَا فِيهِ مِنْ رُّوحِنَا"

یعنی انسان کو نئی توانائیاں بخشیں جو اس سے پہلے دیگر اشیائے کائنات کو حاصل نہیں تھیں۔ ان صفات میں ایک صفت مشیت کی تھی۔ یعنی انسان کو یہ حق عطا ہوا کہ وہ اپنے لئے راستہ آزادانہ طور پر سوچ سکتا ہے اور اختیار کر سکتا ہے۔ انسان کو اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ توانائی یہ روح ہر انسانی بچے کو بلا امتیاز ملتی ہے۔ ہر انسانی بچہ جسم کے ساتھ روح لئے ہوتا ہے۔ جب تک تو وہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے وہ صرف جسم ہوتا ہے اور اس کی ساری ضروریاتِ زندگی کیمیکل طور پر پوری ہو رہی ہوتی ہیں۔ اس لحاظ سے سب بچے برابر ہوتے ہیں۔ ان کا کوئی بھی انفرادی تشخص نہیں ہوتا ہے۔ لیکن جونہی وہ پیدا ہوتے ہیں انہیں ایک شناخت مل جاتی ہے۔ اس شناخت کو اس کی شخصیت بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا ایک نام رکھ دیا جاتا ہے۔ اب وہ انسانی بچے کی صف میں سے ایک قدم آگے نکل جاتا ہے۔ وہ عبید بن جاتا ہے، زید، عمر، بکر بن جاتا ہے۔ جسم کی نشوونما تو بدستور ہوتی رہتی ہے اور اس کے لئے میکانکی پراسیس جاری رہتا ہے جو ہر ذی الحیات کے لئے لازمی ہوتا ہے۔ لیکن اس کی شخصیت کی بنا پر اس کی نشوونما کے تقاضے بدل جاتے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ اب اسے اس شخصیت کی نشوونما کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کے اس تشخص کو نفس کہا جاتا ہے۔ اس نشوونما کے الگ اصول ہیں، الگ طریقہ کار ہے اور جو قرآنِ کریم میں ہے۔ حقیقت میں اپنے اصولوں کا مجموعہ ہے، قرآنِ کریم میں جو ہے وہ سب اسی نفس کی نشوونما کے متعلق ہے۔ قرآنِ کریم کے نزدیک چونکہ نفس تمام انسانی اعمال کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ انسانوں میں جو انفرادیت ہے وہ نفس کی بنا پر ہے ورنہ جسمانی طور پر سب انسان برابر ہیں، سب کی نشوونما کا ایک ذریعہ اور طریقہ ہوتا ہے، انسان کا انسان سے تعلق نفس کی بنیاد پر ہے، جو لین دین بھی ہوتا ہے وہ دو نفوس کے درمیان ہوتا ہے۔ اس لئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ ہر انسان کو اپنے نفس کا پورا پورا علم ہونا چاہیئے کہ اس کا کیا STATUS معلوم نہیں تو کیا مرتبہ اور کیا درجہ ہے۔ اگر کسی انسان کو اپنے نفس کا STATUS معلوم نہیں، تو پھر وہ اس میں تبدیلی لانے کے قابل نہیں ہوگا۔ جب ہم نفس کو پہچان لیں گے، تو پھر اس میں اصلاح بھی کر سکیں گے اور جب اصلاح ہوگی تو ہمارے معاملات بھی سلجھ جائیں گے۔ بالفرض

اگر نفس کی حقیقت نہ ہوتی، تو پھر اس دنیا میں کوئی کاروبار خوش اسلوبی سے سرانجام نہ پا سکتا، کسی کو بھی ایک دوسرے کا اعتبار نہ ہوتا۔ مثلاً اگر مجھے کوئی پیسے دیتا ہے اور میں جسمانی طور پر اس کی پہنچ سے باہر ہو جاتا ہوں، تو پھر وہ مجھ سے اپنے پیسے کیسے وصول کرے گا۔ یہاں سے آخرت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ آخرت کے بغیر نفس اور نفس کی تبدیلی اور قرآن کی تعلیمات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ آخرت پر ایمان یہ ہے کہ ہمارے ہر عمل کا ایک نتیجہ ہے اور یہ نتیجہ ایک دن ہمارے سامنے آئے گا۔ خواہ ہم جسمانی طور پر مر ہی کیوں نہ جائیں۔ اس لئے ایمان بالآخرت تغیرِ نفس کی طرف لے جانے کے لئے بنیاد ہے۔ جب انسان پر کوئی چیز اثر انداز نہیں ہوگی۔ جب تک کہ اس کا پختہ یقین نہ ہو کہ اس کے اعمال کے نتائج ضرور سامنے آئیں گے اور اس کو بھگتنے پڑیں گے۔ خواہ وہ اس طبعی دنیا سے ماورا کیوں نہ ہوں۔ نفس خدا کی طرف سے عطا شدہ ہے۔ یہ ماں کے پیٹ سے نہیں ملتا۔ یعنی اس کی مادی بنیاد نہیں ہے۔ لہٰذا جسم کے مرنے کا اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا۔ قرآنِ کریم کے مطابق یہ قائم و دائم رہتا ہے۔ ہمارے ہاں یہ تصور عام ہے کہ نفس کی تین قسمیں ہیں۔ نفسِ امّارہ، نفسِ لوّامہ اور نفسِ مطمئنہ۔ قرآنِ کریم کی رُو سے نفس الگ الگ نہیں بلکہ ایک ہی نفس کی تین حالتیں ہیں۔ انسان کو ایک ہی نفس ملتا ہے۔ یہی نفس انسان سے سب کام کرواتا ہے۔ جس طرح سے اس کی نشوونما ہوتی ہے ویسا ہی وہ نفس کہلاتا ہے۔ ہم اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے جو کام بھی کرتے ہیں ان کا اثر نفس پر پڑتا ہے۔ نفس کی تقویت اور انتشار کا باعث ہمارے اعمال ہوتے ہیں۔ اگر یہ اعمال قرآن شریف کے مطابق ہیں، تو نفس میں استحکام پیدا ہوگا اور اگر ان کے برعکس اعمال ہوں گے تو نفس میں ضعف پیدا ہوگا۔ قرآنِ کریم نے پرکھ کا معیار نفس کو قرار دیا ہے۔ اگر کسی نے اپنے آپ کو پرکھنا ہو تو اسے یہ نہیں دیکھنا چاہیئے کہ اس کے پاس کتنی دولت جمع ہو گئی ہے۔ بلکہ اسے دیکھنا چاہیئے کہ اس کے نفس کی نشوونما کتنی ہوئی ہے۔ یہی چیز خدا کی قربت کا باعث ہے اور یہی وہ پیمانہ ہے جس سے قربتِ خداوندی کو ماپا جاتا ہے۔ نفس کی تبدیلی کے جو اصول قرآنِ کریم نے دیئے ہیں انہیں میں آئندہ سیشن میں پیش کروں گا۔ اس کا تعلق چونکہ نظامِ حیات کے شعبے سے ہے۔ لہٰذا اس کے لئے وقت درکار ہے۔ ہم نے انسانوں کو ایک گروہ سے نکال کر دوسرے گروہ کی طرف لے جانا ہے اور اس کے لئے قرآنی تعلیمات سے وابستہ رہنا اور اس پر عمل کرنا از حد ضروری ہے۔

حالاتِ حاضرہ اور قرآنی تعلیمات

بشیر احمد عابد

حاضرینِ گرامی، السلام علیکم! قرآن میں ارشاد ہے۔ اگر ہماری تعلیمات پر علم الیقین نہ ہو تو اس دنیا میں گھوم پھر کر دیکھ لو، عین الیقین ہو جائے گا، قوموں کی حالت خود بتا دے گی کہ ہماری تعلیمات کس قدر صداقت پر مبنی ہیں۔ اس میں اچھی روش کے نتائج بھی ملیں گے اور خلاف ورزیوں کے عواقب بھی نظر آئیں گے۔ آپ دیکھیں گے کہ جس طرح قوموں کے عروج کی بنیادیں قرآنی ثمر سے اٹھتی ہیں۔ اسی طرح تہذیب و تمدن کے فلک بوس قصر ناز بھی ان سے غفلت کی بنا پر مہیب کھنڈرات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ وقت کی کمی کی بنا پر اپنے دیگر ساتھیوں کی طرح شاید میں بھی اس موضوع کا مکمل احاطہ نہ کر سکوں۔ بہرحال کوشش کروں گا کہ اس موضوع پر آپ کو اتنی معلومات فراہم ہو جائیں جن سے آپ کو کسی نتیجے پر پہنچنے میں دشواری نہ رہے۔ قرآنِ کریم کی ایک نہایت خوبصورت دعا ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا

میری یہ انتہائی پسندیدہ دعا ہے۔ ہوتا یوں ہے کہ ہر نئی تعلیم، نئے نظریہ، نئی جماعت کے ساتھ وابستہ ہونے پر شروع شروع میں بڑا جوش و خروش پایا جاتا ہے، اس وقت ہر بات خوب لگتی ہے، کوئی نقص یا پیچ نظر نہیں آتا۔ لیکن کچھ ہی عرصے بعد وہ جوش بھی ٹھنڈا پڑ جاتا ہے اور پھر یہ خرابی اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس ردِّ عمل کی مجھے آج تک سمجھ نہیں آتی۔ شاید یہ ہماری تربیت کی کوئی خامی ہو، بہرحال ہماری یہ روش عام ہے۔ ہماری سے مراد ہم سب انسانوں کی روش بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ یہ روش انسانوں کی بنیادی کمزوری بن گئی ہے۔ اس کمزوری سے مفاد پرست طبقہ بہت فائدہ اٹھاتا ہے۔ سیاستدان ہوں یا مذہبی پیشوائیت سب کا وجود انسان کی اسی کمزوری کا رہینِ منت ہے۔ آندھی اور طوفان بن کر آتے ہیں، انسانوں کے سینوں میں سلگتی چنگاریوں کو شعلہ آفریں بنا کر ان کی جیبیں خالی کرتے ہیں اور جب ہوش آتی ہے تو اس وقت سب کچھ لٹ چکا ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اسی لئے اپنے نظام کی بنیاد جذبات پر نہیں بلکہ عقل و بصیرت پر رکھی ہے، وہ چاہتا ہے کہ آپ ہر کام سوچ سمجھ کر کریں اور ہر کام کے لئے دلیلیں مانگیں۔ حتّٰی کہ خدا بھی اگر کوئی حکم دے تو اس کے لئے دلیلیں مانگیں۔ خود انبیائے کرامؑ کا یہ شیوہ رہا۔ حضرت ابراہیمؑ کو حکم ملا کہ ہماری تعلیمات کو قوم میں عام کرو، تمہاری قوم کو اسی سے نئی زندگی ملے گی۔

آپ نے دلیل چاہی اور آپ کو اس کی دلیل باہم پہنچائی گئی۔ لیکن جب یہاں تربیت جذباتی انداز میں ہوتی ہے، تو پھر ہماری روش یہی رہے گی۔ جب تک جذبات گرم رہے اور جیسے جذبات ٹھنڈے ہوئے، وہیں جوش

بھی ٹھنڈا پڑا۔ قرآنِ کریم نے اپنے نظام کے جملہ قوانین و اصول بتانے کے بعد ان دعائیہ کلمات کو پیش کیا ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ "اے ہمارے نشوونما دینے والے رب! ہمیں انہی تعلیمات پر پورے صدق و عدل کے ساتھ عمل کرنے کی توفیق عطا فرما اور ہمارے دلوں کو کجی پیدا ہونے سے محفوظ کر دے۔" طلوعِ اسلام تحریک سے جو بھی وابستہ ہوتا ہے، شروع میں نہایت پُرعزم ہوتا ہے۔ لیکن کچھ ہی عرصے کے بعد وہ اس تحریک میں طرح طرح کے نقص اور خامیاں تلاش کرتا ہے، اسے یہ پروگرام ناممکن العمل دکھائی دیتا ہے، یہ لوگ سست رفتار اور غیر دلچسپ نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بات واضح کر دوں کہ تحریک طلوعِ اسلام کا بنیادی مقصد حضرات کی صلاحیتوں کی نشوونما ہے۔ آپ کو قرآنِ کریم کے تجویز کردہ اصولِ ہدایت سے آگاہ کرنا مقصود ہے۔ اس کے بعد ان سے فائدہ اٹھانا آپ کا عمل ہے۔ دیگر تحریکیں آپ کو بڑی فعال نظر آئیں گی۔ لیکن وہ اس سے فعال نہیں ہوتیں کہ اس سے ان کے کارکنوں کو کچھ فائدہ پہنچے، وہ اپنے ذاتی مفادات کے لئے متحرک اور فعال ہوتی ہیں۔ تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصد ذاتی منفعت نہیں، آپ کو اس میں کوئی ایسا کرتا دھرتا نہیں ملے گا جس کا کوئی ذاتی مفاد ہو۔ یہ سب لوگ اس لئے زمامِ کار سنبھالے ہوئے ہیں تاکہ اس سے آپ لوگوں کو فائدہ پہنچے۔ اگر ہماری اس کاوش سے کسی کو فائدہ نہیں پہنچتا، تو پھر یہ سب بیکار ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ میں وہ صلاحیتیں پیدا ہوں جو قرآنی نظام کو نافذ کرنے کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ آپ بجائے دوسروں کی طرف دیکھنے کے خود اس قابل ہو جائیں کہ قرآنی اصولوں کا تحفظ کر سکیں، قرآنی اقدار کا نفاذ کر سکیں، جہاں کہیں بھی آپ کو کوئی ایسا نظر آئے جو قرآنی اصول یا قدر کی خلاف ورزی کر رہا ہو تو آپ اسے سمجھا سکیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ آپ قرآنِ کریم کا نہایت کثرت سے مطالعہ کریں اور ہمیشہ اسے بہتر طور پر سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ نے قرآنی نظام نافذ کرنا ہے۔ اس لئے جدوجہد اور ثابت قدمی نہایت ضروری ہے اور یہ ہم میں سے ہر فرد کو کرنی پڑے گی۔

اس میں لیڈر کا سوال نہیں، پارٹی کا سوال نہیں، خاص افراد کا سوال نہیں بلکہ یہ ہر طالب علم قرآنی کا بنیادی فرض ہے کہ وہ اپنے طور پر بھرپور جدوجہد کرے جس طرح ایک مفلس اور غریب شخص کو اپنی غربت سے باہر نکلنے کے لئے انتہائی جدوجہد کرنی پڑتی ہے، اسی طرح پوری قوم کو جہالت اور افلاس کے سمندر سے نکالنے کے لئے ہمیں جدوجہد کرنی پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ امن اور خوشحالی کی زندگی جسے جنتی زندگی کہا جاتا ہے وہ یونہی نہیں مل جاتی۔ اس لئے انتہائی ثابت قدمی سے بھرپور جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم تمہیں بھوک کے خوف، مالی و جانی نقصانات سے دوچار کریں گے تاکہ تمہاری صلاحیتوں میں نکھار پیدا ہو اور جب تک تمہاری صلاحیتوں میں قوت پیدا نہیں ہو گی، تم قرآنی نظام کو نہیں سنبھال سکو گے۔ ہم معاشرتی نظام سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمیں حفاظت پہنچائے، ہماری ناہمواریوں کو دور کرے اور ہمیں عصبیت اور تنگ نظری سے بچائے۔ لیکن مفاد پرست طبقے ایسا نہیں ہونے دیتے۔ اب ان طبقوں سے نجات کیسے حاصل ہو گی۔ بیٹھے بٹھائے؟

...رنے سے توکبھی نہیں ہوگی. ہم کو ان کے خلاف آواز اٹھائی پڑے گی، ہمیں قدم اٹھانا پڑے گا اور یہی خدا
...ت ہے. اگر ہم خدا سے ذرا بھر بھی لگاؤ رکھتے ہیں اور اسے اپنا خالق و مالک تسلیم کرتے ہیں، تو ہمیں اچھی طرح
...ینا چاہیئے کہ ایک دن ہم نے اس کے روبُرو حاضر ہونا ہے اور وہ ہم سے پوچھے گا کہ ہم نے اس کے احکام پہ
...ں کیا. ہمیں چاہیئے کہ ہم اگر یہاں جنت قائم نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا کچھ تو کر لیں جو قیامت کے دن ندامت
...ئے جائیں. یاد رکھئے. اس وقت پوری دنیا جس سیاسی و معاشی بحران کا شکار ہے اس کی بنیادی وجہ قرآنی
...ت کی خلاف ورزی ہے اور جہاں جہاں آپ کو ترقی و خوشحالی دکھائی دیتی ہے اس کی بنیادی وجہ بھی قرآنی
...ت ہیں. اب جب کہ دنیا سمٹ گئی ہے کہ ایک دوسرے کی سرگوشی تک سنائی دینے لگی ہے، قرآنی طالب علم
...ے کی حیثیت سے ہماری ذمہ داریاں دوچند ہوگئی ہیں. قرآن نے مومن کا فریضہ "شھداء علی النّاس"
...ے. یعنی پوری قوم کو انسان کا نگران مقرر کیا ہے. اس لئے ضروری ہے کہ ہمیں حالاتِ حاضرہ کا پورا پورا علم
...یئے، دنیا کا ہر معاملہ ہماری نگاہ میں ہونا چاہیئے. اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ کس قرآنی قدر کی پاداش میں
...ن آیا اور کس قدر کی اتباع میں ابرِ رحمت برسا. اس سلسلے میں آپ کو پہلے بیروت لے چلتا ہوں جو ایک زمانہ
...شرقِ وسطیٰ کا عروس البلاد کہلاتا تھا، پوری دنیا میں یہ امن و خوشحالی کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا، لوگ دنیا کے
...ے کونے سے یہاں سیر و تفریح کے لئے آتے اور سال بھر کی مشقت اور تکان اتارتے. حقیقتاً یہ سب کچھ فریب نظر
... تہذیب کے اس قصرِ مشیّد کی بنیادیں الحاد پر اٹھی تھیں اور فطرت کا اصول یہ ہے کہ وہ ایسے معاشرے کو زیادہ
...تک پنپنے نہیں دیتی، قرآنِ کریم میں ہے.

"ایسی خوشحالی اور امن تھوڑے عرصہ کے لئے ہوتا ہے."

بہت جلد وہ معاشرہ جہنم بن جاتا ہے، اس کی شاندار عمارات مہیب کھنڈرات میں بدل جاتی ہیں اور اس کی آبادی
...ف و خوف میں مبتلا ہو جاتی ہے. میرے ہاتھ میں یہ خبر ہے. لیکن لگتا یوں ہے کہ ملائکہ فطرت کی تفسیر ہے. بیروت
...ہ بالا عمارات کے متعلق لکھتا ہے کہ اب وہ بوسیدہ کھنڈرات میں بدل چکی ہے، جہاں چوہے بھی خوف محسوس
...ے ہیں اور لوگوں کی حالت زار یہ ہے کہ ایک انسان دن بھر کی مشقت کے بعد بھی ایک وقت کی روٹی بآسانی پیدا نہیں
...ا. اس کے بعد یہ دوسری خبر جرمنی سے ہے. اس وقت جرمن قوم دنیا کی خوشحال ترین قوموں میں شمار ہوتی ہے.
...ے عقائد کے متعلق یہ کافر لوگ ہیں، کافروں کی کھیتی کبھی نہیں پنپتی، یہ قرآن کریم کا ارشاد ہے. آیئے دیکھتے ہیں کہ
...ق و فلاح کی کیا وجوہات ہیں. پچھلے دنوں وہاں ایک ٹریفک حادثے میں عورت بُری طرح زخمی ہوئی. عورت حاملہ
...س بچے کو بچانے کے لئے عورت کا زندہ رہنا ضروری تھا. لیکن وہ زندہ نہ رہ سکی. ڈاکٹروں نے اسے جسمانی طور پر
...ندہ رکھا... نے دیا. لیکن اس کا عمل تنفس جاری رکھا. تا آنکہ بچے کی پیدائش ہوگئی. اس سارے واقعہ پر علمی اور مذہبی

طبقوں میں بڑی چہ مگوئیاں ہوئیں۔ ان میں سرِفہرست یہ بات تھی کہ آیا یوں کسی عورت کو زندہ رکھ کر بچے کو پ
سے جرمن دستور کی اوّلیں شق کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ حاضرینِ گرامی سنیئے۔ جرمن دستور کی اوّلیں شق کیا ہے اور پ
قوم کا احساس دیکھئے کہ وہ اس شق کے تحفظ کے لئے کس قدر چوکنی ہے اور پھر خود ہی فیصلہ کیجئے کہ آیا ایسی قوم ترقی کی
جرمن دستور کی شق یہ ہے کہ تکریمِ انسانیت کا تحفظ اور یہی شق قرآنِ کریم کے دستور کی بھی ہے۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ

اس بات کو پھر ذہن نشین کر دیجئے کہ دنیا کا ہر عظیم انسان اور ہر عظیم قوم خواہ اس کا تعلق کسی بھی خطے سے ہو، ک
مذہب یا نظریئے سے ہو وہ ہمیشہ قرآنِ کریم کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ میں آپ دوستوں سے اجازت چ

(شکریہ)

احادیث و تاریخ

محمد ریاض خادر

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم۔ اما بعد معزز اراکینِ بزم مجھے جو موضوع دیا گیا ہے، وہ ا
نوعیت کا نہایت ہی نازک اور مشکل ہے۔ سرِدست میں صرف چند اقتباسات پر ہی اکتفا کروں گا جس سے آپ کو حدیث
کی اہمیت اور اس کا مقام واضح ہو جائے گا۔

كنتم خير امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتومنون بالله

آل عمران

"حدیث کے متعلق نہایت مختصر الفاظ میں میرا مسلک یہ ہے کہ جو حدیث قرآنِ کریم کے خلاف ہو میں اسے صحیح تسلیم نہیں کرتا، حضور نبیٔ اکرمؐ کا کوئی ارشاد یا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ ایسی حدیث کے متعلق میں کہتا ہوں کہ وہ حضورؐ کی حدیث نہیں ہو سکتی۔ اسے آپ کی طرف غلط منسوب کر دیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہے کہ حضورؐ کی کسی حدیث کا انکار نہیں کر سکتا جو حدیثیں قرآن سے نہیں ٹکراتیں میں انہیں صحیح تسلیم کرتا ہوں۔ جو شخص رسول اللہؐ کے کسی ارشاد یا حضورؐ کے کسی عمل کی صداقت سے انکار کرتا ہے میرے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا۔ اس لئے کہ حضورؐ کے ارشادات و اعمال سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے تمام انسانیت کے لئے اسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔ اس اسوۂ حسنہ سے انکار نہ صرف

انکارِ رسالت ہے بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے۔" (مقامِ حدیث)

علامہ اقبالؒ کا یہ شعر باباجیؒ کی نذر کرتے ہوئے اپنی گفتگو کا آغاز کرتا ہوں۔

میں ظلمتِ شب میں لیکے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرر فشاں ہوگی آہ مری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

میں اپنی سمجھ کے مطابق اس آیتِ مقدسہ کی روشنی میں چند گزارشات آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنی علمی کا پورا احساس ہے اور یہ بات میں کسی کسرِ نفسی کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ زمانے سے جس کی جستجو تھی سو وہ مل گیا۔ یہی ان خیالات کا اظہار ہے۔ اس آسمان نے وہ دَور بھی دیکھا ہے کہ جب دعوتِ اسلامی نے ایک ایسی انسانی نسل تیار کی تھی جس کی شان پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ اس نسل سے مراد رسولِ اللہؐ کے صحابہ کرامؓ ہیں۔ اس کے بعد تاریخی ادوار میں اس طرز اور کردار کے لوگ وجود میں نہیں آئے۔

اگرچہ اس کردار کے افراد تو بلاشبہ موجود تھے۔ مگر اس طرح کبھی بھی وہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکے جیسے کہ قرونِ اولیٰ میں جمع ہوئے تھے۔ آخر کیا بات ہے، کیا راز ہے کہ وہ جمعیت کیوں وجود میں نہیں آئی۔ حالانکہ ہمارے پاس اللہ تعالیٰ کی کتاب اور کتاب کو پیش کرنے والی ہستی رسول اللہؐ کی تعلیمات آج بھی اسی طرح ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں جس طرح وہ پہلی جمعیت کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ ذہن میں سوال ابھرتا ہے اور جیسا کہ بعض دینی حلقوں کی طرف سے یہ کہا بھی گیا ہے کہ اُس وقت رسول صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اس جمعیت کے قائد تھے اور اب یہ صورت حال نہیں ہے۔ لیکن کیا یہی فرق اس مثالی تنظیم کے وجود میں آنے کا سبب ہے؟ نہیں اگر آپؐ کی ذاتِ اقدس ہی کا وجود اسلامی ریاست کے قیام اور اس کے بارآور ہونے کے لئے حتمی و ناگزیر ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس اسلام کو ہرگز پوری انسانیت کا دین قرار نہ دیا ہوتا اور نہ ہی اسے انسانیت کے لئے آخری پیغام کی حیثیت دی ہوتی بلکہ نہ ہی روئے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کے معاملات و مسائل کی اصلاح کی ذمہ داری قیامت تک اس کے سپرد کی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ اس لئے وہ علیم و خبیر جانتا ہے کہ اسلام حضورؐ کے بعد بھی ہو سکتا ہے اور انسانیت اس کے ثمرات سے بہرہ ور ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جب اس دعوت کو ۲۳ سال گزر گئے اور وہ اوجِ کمال تک پہنچ گئی، تو اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو اپنے جوارِ رحمت میں طلب کر لیا۔ اس دین کو رہتی دنیا تک جاری و ساری کر دیا۔ آپس آپ کا وجود گرامی نگاہوں سے اوجھل ہو جانا معیاری اسلامی جمعیت کے فقدان کا باعث قرار نہیں دیا جا سکتا۔ آیئے دیکھیں پھر وہ کیا سبب ہے جس کی وجہ سے آج امتِ مسلمہ ذلت کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ آیئے اُس چشمِ صافی پر نگاہ ڈالیں۔ جب سے قرونِ اولیٰ نے فہم و شعور حاصل کیا تھا شاید اس میں تغیر واقع

ہو چکا ہے۔ اس طریقہ کا جائزہ لیں جس کے مطابق انہوں نے تربیت حاصل کی تھی۔ ممکن ہے اس میں تبدیلیوں نے
پالی ہو، وہ چشمہ جس سے عظیم المرتبت لوگوں رضی اللہ عنہم و رضوانہ نے اسلام کا فہم حاصل کیا تھا وہ صرف قرآن تھا
حضورؐ کی تعلیمات اس چشمے سے پھوٹنے والے سوتے تھے۔ جب ام المومنین حضرت عائشہؓ سے پوچھا کہ حضورؐ کے اخلاق کیسے
تھے تو آپ نے فرمایا:

کان خلقہ القرآن　　قرآن کا چلتا پھرتا نمونہ تھے۔

معلوم ہوا کہ صرف قرآن ہی وہ واحد سرچشمہ تھا جس سے صحابہ کرام سیراب ہوتے تھے۔ اس واقعہ سے ظاہر ہوا کہ آپؐ
اسلام کی اوّلین نسل جو ابھی دورِ تعمیر سے گزر رہی تھی، صرف ایک چشمہ اکتسابِ فیض کے لئے رکھا اور وہ تھا قرآن۔ آپ
منشا تھا کہ اس جماعت کے دل صرف کتاب اللہ پانے کے لئے خالص ہو جائیں اور اس کے مطابق اصلاح کریں۔ آپؐ
دیکھ کر غضب آلود ہوئے کہ عمرؓ قرآن کی بجائے ایک دوسرے ماخذ کی طرف مائل ہیں۔ دراصل رسولؐ اللہ ایک ایسی لاثانی نسل
تیار کرنا چاہتے تھے کہ جس کا دل و دماغ نہایت پاکیزہ اور مطہر ہو، جس کا احساس شعور انتہائی صاف شفاف ہو، جس کی تعمیر
میں قرآن کے طریقہ تربیت کے سوا کسی دوسرے طریقہ کا دخل نہ ہو۔ یہ جمعیت تاریخ میں لاثانی اور یکتا تنظیم سمجھی گئی اور سبب
یہ تھا کہ اس نے دین کے فہم اور تربیت کا اکتساب صرف ایک ماخذ سے حاصل کیا۔ مگر بعد کے ادوار میں یہ صورتحال نہ رہی
اور آنے والی نسلوں نے اس عظیم چشمۂ ہدایت کو اسرائیلات، فلسفہ و منطق اور دیگر دوسرے مذاہب کے بچے کھچے جو آثا
تھے، ان سے مخلوط کر دیا۔ لہٰذا بعد میں صحابہ کرام جیسی کامل اور خالص جمعیت دوبارہ ظہور نہ ہو سکی۔ صحابہ کرام برائے معلومات
یا ادبی ذوق کو تسکین دینے کے لئے یا ذہنی تفریح کے لئے تلاوت یا تدبر نہیں کیا کرتے تھے۔ ان میں کوئی فرد بھی ایسا نہیں ک
جو علمی اور قانونی رموز لکھ کر معلوماتِ عامہ کا دورہ وسیع کرنا چاہتا ہو یا کسی پہلو سے اپنی علمی کمی پورا کرنا چاہتا ہو۔ بلکہ قرآ
کی طرف اُن کا رجوع صرف اس لئے تھا کہ وہ معلوم کر سکیں کہ ان کی انفرادی زندگی میں مالک الملک نے کیا ہدایت دی ہے
جس معاشرہ میں وہ سانس لے رہا ہے اس کی اجتماعی زندگی کے لئے کیا احکام ہیں، اسے اپنے پروردگار کی طرف سے
کیا تفصیلات دی گئی ہیں۔ اس جماعت برگزیدہ کا ہر فرد ایک سپاہی کی طرح جو میدانِ جنگ میں اپنے کمانڈر کی ہدایت
پر فوراً عمل پیرا ہو جاتا ہے۔ اللہ کے احکام موصول ہوتے ہی ان پر بلا چون و چرا کاربند ہو جاتا تھا۔ وہ ایک نشست میں کئی
سورتیں پڑھ نہیں ڈالتا تھا۔ بلکہ آیات تلاوت کرتا، ان کو حفظ کرتا اور ان کو عملی زندگی پر نافذ کرتا۔ اس کی نقل ایک حدیث
میں ملتی ہے۔ اگر وہ محض کیف نشاط مجرد علم آگہی کے ارادے سے قرآن پڑھتے تو ان کو یہ عظیم مرتبہ نہ مل پاتا، ان کی زندگی چلتا
پھرتا قرآن بن گئی۔ وہ ایک عظیم ثقافت کے علمی پیکر بن گئے۔ بلکہ ایک ایسی علمی تحریک بن گئے۔ جس نے انسانی زندگی کا دھا
بدل دیا۔ قرآن اپنے خزانے کی کنجی صرف انہیں عطا کرتا ہے جو اس جذبہ کے ساتھ اس کی بارگاہ میں حاضر ہوتے ہیں۔ اب
میں چاہتا ہوں کہ جب کبھی ہم اس چشمِ صافی کی طرف رجوع کریں، تو "علم برائے عمل" کے احساس و جذبہ کے ساتھ نہ ک

لطف اندوز اور بحث و تحقیق کے شوق کی بنا پر ہم اس لئے رجوع کریں کہ ہم سے کیسے انسان بننے کا مطالبہ کرتا ہے۔ تاہم ویسا انسان بن کر دکھائیں۔ ہمارا مقصد یہ ہوگا کہ کس طرح عملی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے، اُسے کس قسم کے اخلاق پسند ہیں، کس قسم کا نظام نافذ کرنے کا خواہاں ہے۔ بے شک یہ مرحلہ بڑا کٹھن اور دشوار ہوتا ہے، اگر ہم اس راستے کے مسافر ہیں جس پر پہلی منفرد جماعت چل چکی ہے اور ہم بھی نفوسِ قدسیہ کے نقشِ پر چلنا چاہتے ہیں جن کے ذریعے اللہ نے جاہلیت پر تو ہمیں سب کچھ سہنا ہوگا، ہم اپنی مرضی کے مالک نہیں ہیں۔

اِنَّ اللّٰہ

لہٰذا، ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ ہمارے مؤقف کی روح کیا ہے، اس کے نشیب فراز کیا ہیں۔ تاکہ ہم بھی اس کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں جس سے صحابہ کرامؓ ہوئے تھے۔ آخر میں مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ ہمارے دل ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبات سے لبریز ہو جائیں اور ہماری خواہش ہونی چاہیئے کہ ہدایت کی جو روشنی اللہ نے عطا کی ہے انہیں بھی نصیب ہو اور جس اُفق پر وہ محوِ پرواز ہیں، ان کو بھی وہاں لائے۔ آخر میں اللہ سے دُعا ہے۔

"اے ہمارے رب! جب تو ہمیں سیدھے راستے پر لگا ہی چکا ہے تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کرنا کیونکہ حق کو چھوڑنے کے بعد گمراہی کے سوا اور کیا ہاتھ لگ سکتا ہے۔

(جاری ہے)

عبداللہ خالد خان۔ لالہ موسے

اجتہاد کی اہمیت

اجتہاد کیا ہے؟ اس سوال کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ قرآن اور حدیث پر قیاس کر کے شرعی مسائل کا اخذ کرنا اجتہاد کہلاتا ہے۔ اللہ کریم نے قرآن کریم میں جابجا غور و فکر کی تلقین کی ہے۔ سورہ الفرقان آیت ۷۳ میں اللہ تعالیٰ مومنین کے متعلق فرماتا ہے۔ (ترجمہ) "جب ان کے سامنے آیاتِ خداوندی پیش کی جائیں تو ان پر بھی بہرے اور اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے"۔ یعنی قرآن کے احکامات بھی غور و فکر کے بعد قبول کرتے ہیں۔ دین کے معاملات میں اندھا یقین (FAITH) نہیں بلکہ فہم و فراست سے تفکر و تدبر کے بعد یقین کرنا (CONVICTION) مومنین کی نشانی ہے۔

قرآن کی تعلیم کا یہ اعجاز ہے کہ اس میں بجز چند احکام کے اصول اور حدود متعین کر دیئے ہیں، جزوی اور تفصیلی قوانین مقرر نہیں کئے یعنی جزئیات اور تفصیلات طے کرنے کی ذمہ داری امت پر چھوڑ دی گئی ہے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ پہلی صدی ہجری کے وسط سے چوتھی صدی ہجری تک قریب انیس فقہی مذاہب (SCHOOL'S OF THOUGHT) وجود میں آئے۔ ان فقہی مکاتیب فکر نے اجتہاد کو بڑی وسعت دی۔ یہ حضرات امت کے مسائل فکر اور قیاس کی روشنی میں حل کرنے کا عقیدہ رکھتے تھے۔ مگر بغداد کی تباہی نے جہاں ملت کی سیاسی مرکزیت کو تہہ و بالا کر دیا وہیں افکار و خیالات پر ایک جمود طاری ہو گیا۔ علامہ اقبالؒ نے ان حالات کا تذکرہ اپنے خطبات میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

> "امت کو مزید انتشار سے بچانے کے لئے جو سیاسی زوال کا فطری نتیجہ ہوتا ہے قدامت پسند مفکرین نے یہی سوچا کہ قوم میں معاشرتی وحدت کو قائم رکھا جائے اور اس کا یہی طریقہ تھا کہ شرعی مسائل کے متعلق جو فیصلے فقہائے اسلام پہلے کر چکے تھے سب پر انہی کی پابندی لازم قرار دی جائے۔ یعنی ان کے پیشِ نظر ملت کا معاشرتی نظم تھا اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اس باب میں کسی حد تک حق بجانب بھی تھے۔ اس لئے کہ جماعتی نظم زوال

آمادہ عناصر کی کچھ نہ کچھ روک تھام تو کر ہی دیتا ہے۔"

اس روش نے بعد میں اسلام کو کس قدر نقصان پہنچایا اس کا بین ثبوت یہ ہے کہ اسلام جو حرکت و عمل کا نام تھا آہستہ آہستہ خانقاہیت کے جمود میں بدل گیا۔ تفکر و تدبر کا دروازہ بند کر دینے سے خوفناک فکری و ذہنی سہل پسندی نے جنم لیا۔ علامہ اقبالؒ اسی سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

"کسی قوم کے مستقبل کا انحصار ان کے جماعتی نظم پر اتنا نہیں ہوتا جتنا افراد کی قوت اور صلاحیت پر ہوتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں جس میں جماعتی نظم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے فرد کی انفرادیت کچل کر رہ جاتی ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے معاشرتی فکر کی دولت کا مالک تو بن جاتا ہے۔ لیکن اس کی روح مردہ ہو جاتی ہے۔ قوموں کے زوال کا علاج ان کے ماضی کی تاریخ کے جھوٹے احترام اور اس کے مصنوعی احیاء سے نہیں ہو سکتا۔"

علامہ اقبالؒ ان چند جملوں میں بہت بڑی حقیقت بیان کر گئے ہیں۔ آج ہمیں جا بجا اسلاف کی غلط تقدیس اور ماضی کی تاریخ کے مصنوعی احیاء کے سلسلہ میں تشدد آمیز تقلید کے مظاہر عام دیکھنے کو ملتے ہیں۔ حالانکہ ایسا کرنیوالے اپنے زعم میں اسلام کی سب سے بڑی خدمت اور مقدس فریضہ انجام دے رہے ہوتے ہیں۔ وہ اس عمل کو اسلام کی ترقی کا پیش خیمہ قرار دیتے ہیں۔ اسلام جو نوعِ انسان کو ہر قسم کی غلامی سے آزادی دلانے کی تعلیم اپنے دامن میں رکھتا ہے۔ اس فکری جمود اور مذہبی تشدد نے اس ارفع تعلیم کو بھی نظر انداز کر دیا اور بدترین شخصیت پرستی نے جنم لیا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں کہا ہے کہ

"تاریخ کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ خیالات اور نظریات جو اپنی توانائی کھو کر فرسودہ ہو چکے ہوں ان لوگوں میں کبھی پھر سے توانائی حاصل نہیں کر سکتے جنہوں نے انہیں فرسودہ بنا دیا ہو۔ لہٰذا زوال آور عناصر کی روک تھام کا مؤثر طریقہ صرف یہ ہے کہ قوم میں بخود خزیدہ (SELF-CONCENTRATED) افراد کو پیدا کیا جائے۔ یہی وہ افراد ہیں جو زندگی کی گہرائیوں کے سربستہ راز کھولتے ہیں، وہ ایسے نئے معیار زیست سامنے لاتے ہیں۔ جن کی روشنی میں ہم یہ دیکھنا شروع کر دیتے ہیں کہ ہمارا ماحول ایسا غیر متبدل نہیں کہ اسے چھوا تک نہ جائے۔ تیرھویں صدی اور اس کے بعد کے علماء کا یہ رجحان کہ ماضی کی غلط تقدیس سے جماعتی نظم کو جامد اور متصلب طور پر قائم رکھا جائے اسلام کی روح کے یکسر خلاف تھا۔"

اجتہاد درحقیقت شرعی قوانین کی تدوین کا ایک طریقہ (PROCESS) تھا۔ ان قوانین کا ماٰخذ (SOURCE) نہیں تھا۔ مگر زوالِ بغداد کے بعد یہی چیز قانون شریعت کا ماٰخذ قرار پاگئی۔ اس وقت سے کہا جانے لگا کہ اسلاف نے اپنے اجتہاد سے جو مسائل مستنبط کئے ہیں وہ غیر متبدل قوانین کی حیثیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا فقہ کی کتب ہی قوانین کا سرچشمہ ہیں۔ فسادات پنجاب کے سلسلہ میں جسٹس منیر کی عدالت میں اسی مکتبِ فکر کے ایک نمائندے نے اس مسلک کو پیش کیا تھا جس پر جسٹس موصوف نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ اگر صورتِ حال یہ ہے تو پھر مملکتِ پاکستان کو کسی لیجسلیٹو اسمبلی کی ضرورت ہی نہیں، صرف ہیئت مجریہ (EXECUTIVE MACHINERY) کی ضرورت ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اجتہاد کے مسئلے پر بڑی شرح وبسط سے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"آیئے! اب ایک نظر ان اصولوں پر ڈالیں جو قرآن نے قانون سازی کے سلسلے میں دیئے ہیں ان پر غور کرنے سے یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان اصولوں کی رو سے یہ قطعاً نہیں ہوتا کہ انسانی فکر سلب ہو جائے اور قانون سازی کے لئے کوئی میدان ہی نہ رہے۔ اس کے برعکس ان اصولوں میں جس قدر وسعت رکھی گئی ہے اس سے انسانی فکر بیدار ہوتی ہے۔ یہی وہ اصول تھے جن کی راہ نمائی میں ہمارے فقہاء نے قانونِ شرعی کے متعدد نظام (سسٹم) مرتب کئے اور تاریخ اسلام کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہے کہ سیاسی اور معاشرتی نظامِ زندگی کی حیثیت سے اسلام کو جو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی تو اس کا کم از کم آدھا حصہ ان ہی فقہا کی بالغ نظری کا رہین منت تھا.....

..... لیکن اس تمام ہمہ گیری کے باوجود یہ قانونی ضوابط بالآخر انفرادی تعبیرات کا مجموعہ ہیں۔ اس لئے انہیں حتمی اور قطعی سمجھ لینا غلط ہے۔ مجھے اس کا علم ہے کہ علمائے اسلام کا یہ عقیدہ ہے کہ ہمارے مشہور مذاہب اپنی اپنی جگہ مکمل اور مختتم ہیں..... لیکن چونکہ اب حالات بدل چکے ہیں اور دنیائے اسلام ان تمام نئی نئی قوتوں سے دوچار اور متاثر ہے جو زندگی کے مختلف گوشوں میں فکرِ انسانی کی نشوونما تقاضے سے وجود میں آگئی ہیں اس لئے مجھے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس قدامت پرستانہ ذہنیت کو باقی رکھا جائے۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا ان مذاہبِ فقہ کے بانیوں میں سے کسی نے بھی اپنی تعبیرات وتاویلات کو کبھی قطعی، کامل اور سہو وخطا سے مبرّیٰ سمجھا تھا؟ کبھی نہیں۔ اس لئے اگر دورِ حاضر کے اعتدال پسند مسلمان زمانے کے بدلے ہوئے حالات اور اپنے تجربہ کی روشنی میں فقہ کے اصول اساسی کی نئی تعبیرات کرنا چاہتے ہیں، تو ان کا یہ طرزِ عمل میرے خیال میں بالکل بجا اور

درست ہے۔ خود قرآن کی یہ تعلیم کہ حیات ایک ترقی پذیر عملِ ارتقاء ہے اس کی مقتضی ہے کہ ہر نئی نسل کو اس کا حق ہونا چاہیئے کہ وہ اپنی مشکلات کا حل تلاش کرے، وہ ایسا کرنے میں سلف کے علمی سرمایہ سے راہ نمائی لے سکتے ہیں لیکن اسلاف کے فیصلے ان کا کے راستہ میں روک نہیں بن سکتے۔"

اسلام تو ثبات و تغیر کے امتزاج کا نام ہے۔ "ثبات" تو وحیٔ خداوندی کو حاصل ہے جو قرآن میں محفوظ اور قیامت تک غیر متبدل ہے۔ مگر "تغیر" وہ جزئیات (ڈائیلاز) ہیں جو قرآن کی روشنی میں اجتہاد کے ذریعے حالات و واقعات کو مدّنظر رکھتے ہوئے اخذ کئے جائیں۔ یہ جزئیات حالات کے تقاضوں کی روشنی میں قابلِ تغیر ہوں گی۔ اس سلسلہ میں علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے:۔

"شریعت سے اللہ کا مقصود بندوں میں عدل و انصاف کا قیام ہے۔ جس طریق کے ذریعے عدل و انصاف قائم کیا جائے گا وہی دین ہوگا، اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائیگا"

(بحوالہ:۔ الطریق الحکمیہ)

یہ ذکر بے جا نہ ہوگا کہ "رابطہ عالمِ اسلامی" کے ترجمان ماہنامہ کی اشاعت بابت رجب ۱۳۹۸ھ بمطابق (جون ۱۹۷۸ء) میں اس نکتہ پر بحث کرتے ہوئے کہ "زکوٰۃ کے متعلق رسولؐ اللہ کے متعیّن فرمودہ جزئیات میں تبدیلی ہو سکتی ہے یا نہیں" لکھا تھا۔

"زکوٰۃ کا مقصد یہ ہے کہ وہ حاجت مندوں کی ضروریات کو پورا کرے اور ان کی پریشانیوں کو دُور۔ اگر حاجت مندوں کی پریشانیاں دور نہیں ہوتیں تو پھر اس شرح سے زکوٰۃ ادا کرنے سے زکوٰۃ ادا کرنے والے کی ذمہ داری ختم نہیں ہوتی ..... زکوٰۃ کا انتظام کرنے والوں اور حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ صاحبِ نصاب لوگوں سے زیادہ شرح سے زکوٰۃ وصول کریں کیونکہ رسولؐ اللہ نے جو شرح مقرر کی تھی وہ آپ کے زمانے کی ضروریات کے مطابق تھی اور قرآنِ مجید نے اس کی کوئی حد مقرر نہیں کی۔ اس کے لئے اس نے اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا ہے۔" (بحوالہ:۔ طلوع اسلام ص۳۲)

علامہ اقبالؒ وہ عظیم مفکر ہیں جنہیں قدرت نے غیر معمولی بصیرت عطا کی تھی۔ انہیں اسلامی تعلیمات کی حرکیاتی روح کا گہرا شعور حاصل تھا۔ انہوں نے خطبات میں لکھا ہے:۔

"مجھے اس میں ذرا شُبہ نہیں کہ اگر اسلامی قانون سے متعلق ضخیم لٹریچر کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو اس سے دورِ حاضر کے ناقدین کے اس سطحی خیال کی تردید ہو جائے گی کہ

اسلامی قانون جامد اور ناقابلِ ترقی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں کا قدامت پرست طبقہ ابھی اس کے لئے تیار نہیں کہ قانون سازی کے مسئلہ کے متعلق تنقیدی نقطۂ نگاہ سے گفتگو کی جائے۔ اگر کسی نے اس بات کو اٹھایا تو یہ اقدام بہت سے لوگوں کے لئے وجۂ ناراضگی ہو جائے گا اور مخالفت کا دروازہ کھول دیگا۔"

لیکن حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے قدامت پسند طبقے کی تنگ نظری اور منجمد افکار کی پرواہ کئے بغیر اسلام میں قانون سازی کے اصول ہی پیش نہیں کئے، یہاں تک کہا تھا:۔

"میرا عقیدہ ہے جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ کے "جورس پروڈنس" (JURISPRUDENCE) پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنی کی ابدیت کو ثابت کر دے گا وہی اسلام میں مجدد ہوگا اور بنی نوع انسان کا سب سے بڑا محسن بھی وہی ہوگا۔ ..... افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہاء یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ..... میری ناقص رائے میں اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر پرکھا جا رہا ہے اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔"

(اقبالؒ نامہ۔ جلد اوّل صفحہ ۵)

یہ باتیں انہوں نے اس زمانے میں کہیں تھیں جب پاکستان کا تصور ان کے نہاں خانۂ ذہن میں پہلو بدل رہا تھا۔ آج ہم حقیقتاً تاریخ کے ایک اہم موڑ پر کھڑے ہیں۔ اس دَور میں جبکہ اسلامی نظام کی جانب کچھ پیشرفت بھی ہو رہی ہے ہمیں علامہ اقبالؒ کے افکار و خیالات سے راہ نمائی حاصل کرنا چاہیئے۔ تاکہ پاکستان اپنی نظریاتی منزل کو پالے۔

اطلاعِ عام

مندرجہ ذیل پمفلٹس ادارہ سے مفت دستیاب ہیں

۱۔ طلوعِ اسلام کا مقصد و مسلک۔ قرآن حکیم کی روشنی میں

۲۔ عورت قرآن کے آئینے میں (بزبان انگریزی)

——— عطیہ بزمِ کویت

ایک خط۔ ایک اپیل

قابلِ احترام جناب عبدالستار خان نیازی صاحب

سلام و رحمت!

آداب کے بعد تحریر کرتا ہوں کہ ٹی وی پر آپ کا پروگرام "قرآنِ مجید کے تراجم" دیکھا۔ بڑے انہماک کے ساتھ دیکھا۔ بڑے عرصہ سے دل میں یہ تمنا تھی کہ کوئی ایسا مفہوم یا ترجمہ قرآنِ حکیم کا گورنمنٹ کے زیرِ نگرانی شائع ہو جو واقعی قرآنی ہو اور اس پر کسی فرقہ کی عینک لگی ہوئی نہ ہو۔ بلکہ خالصتاً قرآنی ہو۔ آپ نے فرمایا کہ ترجمہ میں جہاں ابہام پایا جاتا ہے اسے دُور کیا جائے گا۔ یہ بہت اچھی پیش رفت ہے۔ لیکن گذارش یہ ہے کہ قرآنِ کریم میں کہیں بھی ابہام نہیں پایا جاتا۔ بلکہ ترجمہ کرنے والے اپنے مکتبِ فکر کی عینک لگا کر مکھی پر مکھی مارتے ہیں۔ جب دوسرے فرقے کا قاری اُس ترجمہ کو پڑھتا ہے تو اُسے بیشتر جگہوں پر ابہام نظر آتا ہے۔ پھر آپ نے سعودی عرب کا ذکر کیا کہ ایسا ترجمہ ہونا چاہیئے جس پر سعودی عرب کو اعتراض نہ ہو۔ یہ کوئی ضروری نہیں بلکہ ترجمہ خالص قرآنی ہونا چاہیئے' روایت میں لپٹا ہوا نہیں ہونا چاہیئے۔ سب سے پہلے ملک سے فرقہ بازی کو بالکل ختم کیا جائے اور تمام مکتب ہائے فکر کے عالم حضرات کو قرآن کریم کے پلیٹ فارم پر اکٹھا کیا جائے۔ قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پر فرقہ بازی کو عذابِ عظیم کہا ہے۔ جب کہ ہمارے ملک کے مذہبی رہنما کی وجہ شہرت و عزت تفرقہ ہے۔ مثلاً فلاں عالم فلاں فرقہ سے تعلق رکھتا ہے' یہی اس کی پہچان ہے۔ قرآنِ حکیم کی بے مثال تعلیمات کو چھوڑ کر اپنے جذبات سے مزین مکاتبِ فکر تراش لئے ہیں۔ نوجوان نسل کو اسلام سے دُور تر کر دیا ہے۔ معلوم نہیں یہ خط آپ تک پہنچ سکے گا یا نہیں۔ اگر آپ تک پہنچ جائے تو اسے پڑھ کر تراجم کے پروگرام پر نظرِ ثانی ضرور کیجئے گا۔ ترجمہ بذریعہ تصریفِ آیات ہونا چاہیئے' عصری اسلوب میں ہونا چاہیئے۔ اگر یہ روایتی ہوا تو آپ کی محنت کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ آخر میں آپ سے گذارش کرتا ہوں کہ تحریکِ پاکستان کے کارکن قائداعظم محمد علی جناح کے دستِ راست جناب علامہ غلام احمد پرویزؒ صاحب نے قرآنِ کریم پر ۵۰ سال کام کیا ہے اور دو مرتبہ درسِ قرآنِ کریم لوگوں کو دیا جو تقریباً ساڑھے آٹھ آڈیو کیسٹ پر مشتمل ہے اور عصری اسلوب سے آراستہ ہے جس کی نوجوان نسل اور تمام دنیا کو ضرورت ہے۔ جنہوں نے تمام عمر فرقہ بندی سے لوگوں کو منع کیا۔ آپ سے گزارش ہے کہ ترجمہ کرتے

وقت پرویز صاحب کی مفہوم القرآن اور لغات القرآن کو ضرور سامنے رکھئے ورنہ ناانصافی ہوگی کیونکہ دیگر تفاسیر کو زیرِ بحث لاتے وقت ان کو نظر انداز نہ کریں تو بہتر ہوگا۔ جناب غلام احمد پرویز صاحب نے انتہائی محنت اور دلائل و براہین سے قرآنِ کریم پر کام کیا ہے جو لائقِ تحسین ہے۔

محترم نیازی صاحب! پرویز صاحب پہلے شخص ہیں جنہوں نے یہ بات کہی کہ قرآنِ کریم کا ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہو سکتا۔ بلکہ مفہوم بیان کیا جا سکتا ہے۔ آپ نے بھی ٹیلی ویژن پر اس بات سے اتفاق کیا ہے۔ میں آپ کی آراء سے بہت مطمئن ہوں اسی لئے آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ آخر میں آپ سے اپیل کرتا ہوں۔ قرآنِ کریم کو کسی گھڑی ہوئی روایت کے تحت ترجمہ نہ کیا جائے جس سے قرآنِ مجید کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور روایت قرآن کو منسوخ کر دیتی ہے۔ بلکہ قرآنِ مجید کا ترجمہ تصریفِ آیات کے ذریعے کیا جائے۔

ہمارے ملک میں کوئی پوچھنے والا نہیں، روزانہ بے شمار قرآنِ مجید چھپ کر مارکیٹ میں آجاتے ہیں۔ گورنمنٹ کو چاہیئے کہ ایک سٹینڈرڈ بنا کر دے دیں، جو بھی چھاپے اسی کو چھاپے تاکہ یکسانیت قائم رہے۔ میں نے جاپان کی (THE TEACHING OF BUDDHA) دیکھی، وہ بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ اسی طرح عیسائیوں کی بائبل بھی جب چھپتی ہے ایک ہی جیسی ہوتی ہے۔ میں نے اس خط کی کاپی رسالہ طلوعِ اسلام، بلاغ القرآن اور تجلیات القرآن کو بھی بھجوا دی ہے تاکہ عوام الناس کو بھی معلوم ہو۔

آپ کا خیر اندیش

ڈاکٹر حامد حسین ــــ ڈیرہ غازی خان

اطلاعِ عام

مندرجہ ذیل پمفلٹس کثیر تعداد میں دستیاب ہیں

۱. دو قومی نظریہ ــــــــ قیمت ۲ روپے

۲. قرآن کا معاشی نظام ــــــــ قیمت ۲ روپے

۱۰ پمفلٹس خریدنے پر ۳۳٪ رعایت

ــــــــ ناظم ادارہ طلوعِ اسلام

بھارت سے بوسنیا تک

کھنڈر ہو گئیں مسجدیں سینکڑوں!؟؟

جو جھگڑا، کافروں اور مسلمانوں کا جھگڑا ہے
حقیقت میں تو انسانوں سے حیوانوں کا جھگڑا ہے
نہ مندر کا، نہ مسجد کا! نہ شیطانوں کا جھگڑا ہے
نظریاتی حدوں کا ہے یہ۔ ایمانوں کا جھگڑا ہے
کریں کیسے گوارا وہ، صنم خانے میں مسجد کو
کہ باطل اور حق کے آج پیمانوں کا جھگڑا ہے
یہ جھگڑا، اک مسلسل داستاں ہے نوعِ انساں کی
نگاہِ نور سے ہر دم۔ سیہ خانوں کا جھگڑا ہے
یہ جھگڑا ہی نہیں، اک ناچ ہے عفریتِ وحشت کا
جہالت کے نشے میں مست، مستانوں کا جھگڑا ہے
شرافت ہو گئی روپوش، وحشت دندناتی ہے!
خرد حیراں ہے! انسانوں سے انسانوں کا جھگڑا ہے!!
"جیو رکھشا" کے سیوک ہیں، اہنسا کے پجاری ہیں
جیو رکھشا، اہنسا ہی سے۔ دیوانوں کا جھگڑا ہے
رہے مصروف صدیوں تک، جنہیں اپنا بنانے میں
انہی محسن مسلمانوں سے، شیطانوں کا جھگڑا ہے

الف۔ رے۔ خاں بتا دو آج تم سارے زمانے کو
کہ ظلم و جور و نفرت سے، مسلمانوں کا جھگڑا ہے

ا۔ر A.R. KHAN

ڈاکٹر سید عبدالودود

تکملہ
نفسِ واحدہ

اپریل ۱۹۹۳ء کے شمارہ میں ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کے مضمون کا آخری پیراگراف بوجہ اختصار پوری طرح واضح نہ ہو سکا۔ لہٰذا قارئین سے بصد معذرت گذارش ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کی درج ذیل وضاحت کو مضمون کا حصہ تصور فرمائیں۔

محترم اعزاز الدین خان صاحب نے فرمایا تھا کہ اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ نفسِ واحدہ سے مراد جفتہ ہے تو پھر یہ بھی بتانا پڑے گا کہ جفتہ ہی سے اس کا زوج کیسے پیدا ہوا؟

جفتے کے اندر ازواج کیسے پیدا ہوتے ہیں

ہر نوع (SPECIES) میں خلیے کے اندر لونیوں (CHROMOSOMES) کی تعداد مقرر ہوتی ہے۔ انسانی خلیے میں لونیوں کے ۲۳ جوڑے ہیں۔ جن انواع کی پیدائش نطفہ امشاج کے بغیر ہوتی ہے، ان میں ہر جوڑے کے دونوں لونیے ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن انسان سمیت دوسری کئی انواع میں لونیوں کے ایک جوڑے میں ایک لونیہ دوسرے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس جوڑے کے ایک لونیے کو X اور دوسرے کو Y لونیہ کہتے ہیں۔ یہ صنفی لونیے ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں باقی تمام لونیوں کو AUTOSOM یا غیر صنفی لونیے کہتے ہیں۔ نر کا X لونیہ مادہ کے X لونیے کی طرح ہوتا ہے۔ چنانچہ مادہ کے صنفی خلیے میں دو X لونیے اور نر کے صنفی خلیے میں ایک لونیہ X اور دوسرا Y ہوتا ہوتا ہے۔ گویا انسان کے صنفی خلیے میں ۴۶ لونیوں میں سے ۴۴ غیر صنفی ہوتے ہیں اور ۲ صنفی۔ صنفی لونیے کا جوڑا یا XX ہوتا ہے یا XY۔

نر نسبتی خلیے کے لونیے

AAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAA	X
AAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAAA	Y

ماده نسبتی خلیے کے لونیے

A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A X
A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A A X

x خلیہ مادیت کا مظہر ہے۔ جس وقت رحم مادر میں جنین بنتا ہے اس وقت یہ صنفی لونیے غیر نشوونما صورت میں موجود ہوتے ہیں اور جوانی کی عمر میں یہ نشوونما پا جاتے ہیں۔

انسانی خصیتہ الرحم (OVARY) کے غیر پختہ ۴۴ غیر صنفی اور ایک جوڑا x x کا ہوتا ہے اور تخفیفی انشقاق کے بعد ہر بیضہ خلیے میں ۲۲ غیر صنفی اور ایک x لونیہ ہوتا ہے۔ اسی طرح خصیہ یعنی نر تولیدی غدود کے غیر پختہ خلیوں میں ۴۴ غیر صنفی اور ایک جوڑا x y لونیوں کا ہوتا ہے اور تخفیفی انشقاق کے بعد سپرم یا نسبتی خلیے میں دو قسم کے لونیے ہوتے ہیں۔ ۲۲ غیر صنفی لونیے (A) + x اور ۲۲ غیر صنفی لونیے (A) + y۔

بار آوری کے عمل میں دونوں قسموں میں سے کوئی ایک نر خلیہ (SPERM) کسی ایک بیضے کے ساتھ ملاپ کرتا ہے۔ چنانچہ بار آوری کے بعد (۲۲A + x) + (۲۲A + x) = xx + ۴۴A ایسے جفتے بنتے ہیں جن سے نر پیدا ہوتے ہیں اور باقی ۵۰ فی صد جفتے (۲۲A + y) + (۲۲A + x) ہوتے ہیں جو مادہ پیدا کرتے ہیں۔

چنانچہ انسانی نسل میں نر اور مادہ کی تعداد یکساں رہتے ہیں۔ xx اور xy لونیوں کی اگر ترتیب بدل جائے اور وہ اگلی نسل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ مثلاً ایک نقص xxy ہوتا ہے۔ یعنی اس میں سے ایک x لونیہ غائب ہوتا ہے اور 5X باقی رہ جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عورت کا حمل پہلے تین ماہ میں ضائع ہو جاتا ہے۔ ایک نقص xxy ہوتا ہے یعنی اس لونیے میں ایک x فالتو ہے۔ اس نقص کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکا پیدا ہوتا ہے لیکن بالغ ہونے پر اس کے خصیے چھوٹے ہوں گے اور وہ اولاد پیدا نہیں کر سکے گا' علاوہ ازیں وہ ذہنی طور پر نابالغ رہے گا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مختصر سا بیان محترم اعزاز الدین خان صاحب اور دیگر غیر سائنسدان قارئین کے سمجھنے کے لئے کافی ہوگا۔

بیادِ سرسیّد

مقالاتِ سرسیّد (حصہ اوّل) سے ایک اقتباس۔

قرآنِ مجید کے معانی بیان کرنے میں سب سے زیادہ دھوکا انسان کو ان مقامات پر پڑتا ہے جہاں قرآن میں قصص انبیاء سابقین بیان ہوئے ہیں۔ انبیاء سابقین کے قصے عہدِ عتیق کی کتابوں میں بھی آتے ہیں اور علمائے یہود نے بھی قصص انبیاء مستقل کتابوں میں لکھے ہیں جن میں بہت کچھ باتیں دور از عقل و خلافِ قانونِ فطرت مندرج ہیں۔ وہ قصے مشہور تھے اور ہمارے علماء بھی ان سے مانوس تھے اور ان کے عجائبات کو جو قانونِ فطرت کے برخلاف تھے معجزات قرار دیتے تھے۔ وہ قصے قرآن میں بھی بیان ہوئے ہیں اور وہ بیان بہت کچھ اسی کے مشابہ اور مماثل ہے جو ان قصوں کی نسبت بیان ہوا ہے، مگر قرآنِ مجید کے الفاظ ان قصوں میں اسی طرح آئے ہیں کہ ان سے وہ باتیں جو دور از عقل اور خلافِ قانونِ قدرت ان قصوں میں مشہور تھیں ان کا ثبوت نہیں ہوتا۔ ہمارے علماء متقدمین نے اس بات پر خیال نہیں کیا بلکہ جہاں تک ان سے ہو سکا قرآنِ مجید کے الفاظ کو ان قصوں پر لعینہٖ حمل کرنے پر کوشش کی اور اس کے کئی سبب تھے۔

اوّل۔ یہ کہ ان قصوں کی کیفیتِ مشہورہ ان کے دل میں بسی ہوئی تھی، اسی لئے قرآنِ مجید کے ان الفاظ پر انہوں نے توجہ نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ ان کے پاس ہر ایک عجیب چیز کو، گو وہ کیسی ہی قانونِ فطرت کے برخلاف کیوں نہ ہو خدا کی قدرت عام کے تحت میں داخل کر دینے کا نہایت سہل طریقہ تھا اور اس سبب سے ان الفاظ کی حقیقت پر غور کرنے کو توجہ مائل نہیں ہوتی تھی۔ تیسرے یہ کہ ان کے زمانہ میں نیچرل سینز نے ترقی نہیں کی تھی اور کوئی چیز ان کو قانونِ فطرت کی طرف رجوع کرنے والی اور ان کی غلطیوں سے متنبہ کرنے والی نہ تھی۔ پس یہ اسباب اور مثل ان کے اور بہت سے اسباب ایسے تھے کہ ان کی کافی توجہ قرآنِ مجید کے ان الفاظ کی طرف نہیں ہوئی۔

مثلاً ان کے زمانہ میں یہ مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا کہ طوفانِ نوح کا تمام دنیا میں عام ہونا اور پانی کا اونچے سے اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں سے بلند ہو جانا محالات سے اور خلافِ واقع ہے اور اسی لئے ان کے خیال میں یہ بات نہ آئی کہ قرآنِ مجید میں جو الارض کا لفظ ہے اس میں الف لام استغراق کا نہیں ہے، بلکہ عہد کا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے قصے میں کوئی نصِ صریح اس بات پر نہیں ہے کہ درحقیقت ان کو آگ میں ڈال دیا گیا تھا، مگر انہوں نے اس بات پر خیال نہیں کیا۔

اسی طرح حضرت مسیحؑ کی ولادت میں کوئی نصِ صریح قرآنِ مجید میں موجود نہیں ہے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔

بچوں کا صفحہ

اسلامی معاشرت
علامہ غلام احمد پرویزؒ

لغو اور بے حیائی کی باتیں

(۹)

لغو سے پرہیز مہمل اور بے معنی باتوں سے ہمیشہ بچو۔ انہیں لغو کہتے ہیں۔ (لغو کے معنی ہیں پرندوں کی چیں چیں۔ ایسی باتیں جن میں شور ہی شور ہو مطلب کچھ نہ ہو) اس لئے مومنین کا وصف یہ ہے کہ

هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ۝ (۲۳/۳)

"وہ لغو باتوں سے ہمیشہ پرہیز کرتے ہیں"

اگر کہیں اس قسم کی مہمل، بے ہودہ باتیں ہو رہی ہوں تو وہاں سے شریفانہ انداز سے گزر جانا چاہیئے۔

وَ اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (۲۵/۷۲)

"مومنوں کی صفت یہ ہے کہ اگر انہیں کہیں لغو کے پاس سے گزرنا پڑے تو وہ نہایت شریفانہ انداز سے گزر جاتے ہیں"

بے حیائی کی باتیں بے حیائی کی باتوں کے پاس تک نہ پھٹکو۔

وَ لَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ ۚ (۶/۱۵۱)

"اور بے حیائی کی باتوں کے قریب تک

نہ جاؤ۔ خواہ وہ بے حیائی کھلے بندوں ہو یا چھپی ہوئی۔"

بے حیائی کی باتوں کا پھیلانا

نہ صرف یہ کہ خود ہی بے حیائی کی باتوں سے بچنا چاہیئے بلکہ ان باتوں کو سوسائٹی میں پھیلانا بھی نہیں چاہیئے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَةِ (۲۴/۱۹)

"جو لوگ مسلمانوں کے معاشرہ میں بے حیائی کی باتیں پھیلانا پسند کرتے ہیں انہیں اس دنیا میں بھی دردناک سزا دینی چاہیئے اور آخرت میں بھی۔"

گندہ لٹریچر

لہٰذا فحش باتیں، گندے گیت، عریاں لٹریچر یا تصویریں، سینما کی ایسی فلمیں جو بے حیائی پھیلائیں، سب منع ہیں۔ ایسا کرنے والا اسلامی معاشرہ میں بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوتا ہے، اسے سخت سزا ملنی چاہیئے۔

نوٹ: یہ جو کہا گیا ہے کہ لغو، بے ہودہ، مہمل بے فائدہ اور بے حیائی کی باتوں سے بچنا چاہیئے۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف اس قسم کی گفتگو سے بچنا چاہیئے۔ اس قسم کی گفتگو سے بھی بچنا چاہیئے اور ایسے تمام کاموں سے بھی۔

استحکامِ ذات

کے لئے ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ سے آگے بڑھ کر نوعِ انسانی کے مفادِ کلی اور عالمگیر ربوبیت کا انتظام کرے۔

سامعہ اسحاق، کوئین میری کالج

صُبحِ قیامت

ہر سینے میں اک صبحِ قیامت ہے نمودار
افکار جوانوں کے ہوئے زیر و زبر کیا!

جس طرح انسانی جسم میں گردش کرتے ہوئے سُرخ گرم خون کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، بالکل اسی طرح جوان کسی بھی معاشرے میں خون کی سی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والے دنوں میں رنگ بھرنے اور قوموں کے مستقبل کو سنوارنے، بگاڑنے میں نوجوان ایک خاص کردار ادا کرتے ہیں۔ نوجوان قوم کے معمار ہوتے ہیں اور آنے والے کل کی باگ ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا کردار اور سوچ ملکی ترقی میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ علامہ اقبالؒ کے اس شعر سے ظاہر ہے کہ جب تک نوجوانوں کے ذہن میں کوئی مثبت سوچ، کوئی نصب العین اور تعینِ منزل نہ ہو کامیابی کی توقع عبث ہوتی ہے۔ منتشر ذہن اور تعینِ مقصد کے بغیر نوجوانوں کی بھیڑ جنگلوں کے ریوڑھ کی مانند ہے اور کچھ بھی نہیں۔

لیکن جیسے ہی نوجوانوں کو ایک منزل کا راستہ دکھا دیا جائے، ان کے دلوں میں حصولِ مقصد کی شمع جلا دی جائے، تو پھر دنیا کی کوئی طاقت ان کو ایک امید سے بھری صبح کی طلوع سے نہیں روک سکتی:۔

تازہ انجم کا فضائے آسمانی میں ہے ظہور
دیدۂ انسان سے نامحرم ہے جن کی موجِ نور

اس بات کو ہم اگر اپنی قومی زندگی کی ایک مثال یعنی تحریکِ پاکستان کی روشنی میں دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ قائدِ اعظمؒ کی پُرمغز قیادت میں یہ نوجوانانِ ہند ہی تھے جنہوں نے ہندوستان کے گلی کوچوں تک اور امیر سے لے کر غریب، محل سے لے کر جھونپڑے میں رہنے والوں تک تحریکِ پاکستان کا پیغام پہنچایا، دن کا آرام اور رات کی نیندیں قربان کر کے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا کر بلا کسی لالچ کے جہاں ایک طرف انگریز حکمرانوں کے سامنے کھڑے ہو گئے وہاں ہندوؤں اور سکھوں کا مقابلہ کرنے کے ساتھ اپنی قوم کی صفوں میں شامل میر جعفر اور میر صادق جیسے قوم فروشوں کا بھی ڈٹ کر مقابلہ

کیا در آخر اپنی انتھک جدوجہد کے نتیجے میں بظاہر ناممکن نظر آنے والی بات کو ممکن کر دکھایا اور حصولِ [illegible]
پاکستان سے کم کسی بات پر سمجھوتہ نہ کیا۔

تاہم آجکل ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں تو ہمیں نہ نوجوانوں میں وہ شگفتگی نظر آتی ہے جو ان کا شیوہ ہونی چاہیئے، نہ ان کی سوچ میں وہ تعمیری پہلو نظر آتا ہے اور نہ ان میں وہ وسعتِ قلبی نظر آتی ہے جو معمارِ قوم میں ہونی چاہیئے اور نہ ہی ہمیں وہ صفائی اور پاکیزگی نظر آتی ہے جو رگوں میں دوڑتے ہوئے خون میں ہونی چاہیئے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد ناسور کی سی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ نت نئے ہنگامے لڑائی جھگڑے، باہمی قتل و غارت اور چور بازاری جیسی لعنتیں مکمل طور پر غالب آتی نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ تعلیمی ادارے جو ماں کی گود کے بعد ہر طالب علم کے دوسرے بڑے راہنما ہوتے ہیں ان برائیوں کی زد میں آچکے ہیں۔

گو نوجوانوں کی بے راہ روی یا اخلاقی ابتری کی شکایت تو ہر پرانی نسل کو نئی نسل سے رہی ہے۔ تاہم یہ صرف ایک شکایت نہیں ہے بلکہ اس میں حقیقت کا رنگ بھی ہے۔ خصوصًا فی زمانہ اخلاقی انتشار اور معاشرتی بگاڑ ایک عفریت بن کر ہمارے سامنے کھڑے ہیں۔

اس کی وجہ کیا ہے؟ آخر کار نوجوان اپنے مقصدِ حیات سے کیوں ہٹ رہے ہیں؟ یقیناً بہت سے بیرونی عوامل کے علاوہ اہم ترین نوجوانوں کی اخلاقی، ذہنی اور مذہبی تربیت کا فقدان ہے۔ اس کے علاوہ معاشرتی ناہمواریاں اور برائیاں، دولت کی غیر مساوی تقسیم، امیر و غریب میں انتہائی تفاوت، روزگار کے مواقع کا محدود ہونا بھی بہت اہم ہیں۔ اسی طرح بیرونی عوامل، غیر مہذّب یا اخلاق باختہ لٹریچر، کتب اور فلمیں وغیرہ بھی نوجوانوں کی تباہی میں برابر کی شریک ہیں۔

نوجوان نسل کی خرابی میں ایک بڑی وجہ مغرب سے مستعار لیا ہوا نظامِ تعلیم اور دیگر معاشرتی اور تاریخی نظریات ہیں۔ وہ مغربی معاشرہ جو خود توڑ پھوڑ کا شکار ہے، شراب، چرس اور ہیروئن کا سہارا لئے ہوئے اپنی جنس پرستی کے باعث ایڈز کا نیا تحفہ انسانیت کو دینے کا باعث ہے۔

سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ جدید دنیا میں رسل و رسائل کے ایسے وسیلے پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کو روکنا حکومتوں کے بس میں بھی نہیں۔ اور اس کے علاوہ بیک قلم معاشرتی ناہمواریوں اور برائیوں کو بھی نہیں ختم کیا جا سکتا ہے تو آخر کار نوجوانوں کی اصلاح کیسے ممکن ہوگی۔

یاد رکھیں، اس کا حل صرف ایک ہے اور وہ ہے ان کی تربیت کے لئے ایک ایسا تربیتی نظام جو ان میں مثبت سوچ پیدا کرے، ان کی مناسب اخلاقی اور مذہبی رہنمائی کی جائے تاکہ وہ راہِ راست کو پا سکیں۔ دراصل بچے اور نوجوان اپنی ذہنی نشوونما کے دوران اپنے ارد گرد کے ماحول اور معاشرے کے اثرات کو بہت تیزی سے شعوری یا

لاشعوری طور پر جذب کرتے رہتے ہیں اور جس طرح کا ماحول ان کو ملتا ہے مستقبل میں اس ہی کے مطابق اپنے ردِ عمل اور طرزِ حیات کا اظہار کرتے ہیں۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

سو اگر ہم نوجوانوں کی درست تربیت کرنے میں کامیاب رہیں مائیکل جیکسن، کوسٹار، دلیپ کمار اور ڈیانا فرگی جیسی شخصیتوں کے سحر سے آزاد کرانے، دین اور مذہب کی طرف راغب کرنے میں کامیاب ہوں، ان کو ڈاکٹر عبدالسلام اور ڈاکٹر عبدالقدیر خاں کے نقشِ قدم پر چلنے کے تیار کریں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اپنی سرزمین سے انتشار، لاقانونیت، بے اعتمادی، بدحالی اور تناؤ و بے راہ روی کو نکال باہر نہ کریں۔

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل بھی خوابیدہ ہیں

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ نوجوان جسم میں خون کی سی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں اور یہ حقیقت بھی ہے کہ نوجوانوں کو قدرت نے انتھک محنت، جوش و جذبہ اور خود اعتمادی جیسی نعمتوں سے مالا مال کیا ہوا ہے۔ فی زمانہ "عمران خان" کی مثال لیجئے۔ ایک فردِ واحد نے اپنی توانائیاں سامنے لاتے ہوئے کینسر ہسپتال جیسے عظیم الشان منصوبے کو مکمل کرنے کی ٹھانی۔ اسی طرح خواتین میں بے نظیر بھٹو اور عابدہ حسین جیسی خواتین کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں جنہوں نے اپنے کردار اور عمل سے ملک اور قوم کے لئے کامیابیوں کے راستے کھول دیئے اور یوں شاعر کے خواب کو حقیقت دی، جب شاعر نے کہا تھا۔

زمین والوں کے سر ان کے آگے خم ہو رہے ہوں گے
سلامی دے رہا جھک جھک کے ان کو آسماں ہوگا

سو اگر ہم نوجوانوں کو مثبت راہِ عمل پر ڈال دیں، ان کو ایک منزل دکھا دیں، ان کو ذہنی طور پر ہر خطرے اور چیلنج کا مقابلہ کرنے کا سبق پڑھا دیں اور ان کی سوچ میں ولولہ پیدا کر دیں، تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ توڑ پھوڑ، لاقانونیت، ہڑتالوں، ناکہ بندیوں، فائرنگ اور قتل و غارت جیسے قبیح کاموں سے باز رہیں اور اپنی فطری اور قدرتی صلاحیتوں کے بل بوتے پر ایک دفعہ پھر اُسی جوش و جذبہ سے جو تحریکِ پاکستان کے دنوں میں نظر آتا ہے، مملکت خداداد کو تعمیر و ترقی کی شاندار راہ پر گامزن کر دیں۔

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح — مرقدِ انسان کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

یقیناً نوجوانوں کے اندر پنہاں صلاحیتیں اجاگر ہو جائیں تو ہمارے ملک اور قوم کی تقدیر کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔

ملّتِ اسلامیہ پاکستانیہ کے نام

قائدِ اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد

میری نظر میں قرآنِ مجید کے فیصلے کے مطابق دو بدترین اور ناقابلِ معافی جرم ہیں

ایک شرک اور دوسرا تفرقہ

تفرقہ خواہ مذہبی پیشواؤں کے نام پر ہو، خواہ سیاسی رہنماؤں کے نام پر، وطنیت کے نام پر ہو، خواہ رنگ، نسل اور خون کے نام پر ہو، بہرحال جرمِ عظیم ہے۔ ان دونوں جرائم میں سے پہلے جرم (شرک) کی سزا اُخروی زندگی میں ملے گی۔ لیکن دوسرے جرم (تفرقہ) کی سزا اس دنیا میں ذلت و خواری، غلامی اور محکومی کی شکل میں ملے گی اور آخرت میں اس سے بھی بدتر شکل میں۔ یاد رکھو!! اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے ــــ

ایک مومن اور دوسرے کافر ــــ اسی کا نام

دو قومی نظریہ ۲

ہے۔ مومنین کے اندر کسی بنیاد پر تفرقہ ناقابلِ معافی جرم قرار پائے گا۔

(بحوالہ مولانا غلام مرشدؒ (سابق خطیب بادشاہی مسجد لاہور۔ ۶۶۔ ۱۹۳۵ء)
(ماخوذ از مجلہ طلوعِ اسلام۔ جولائی ۱۹۷۶ء)